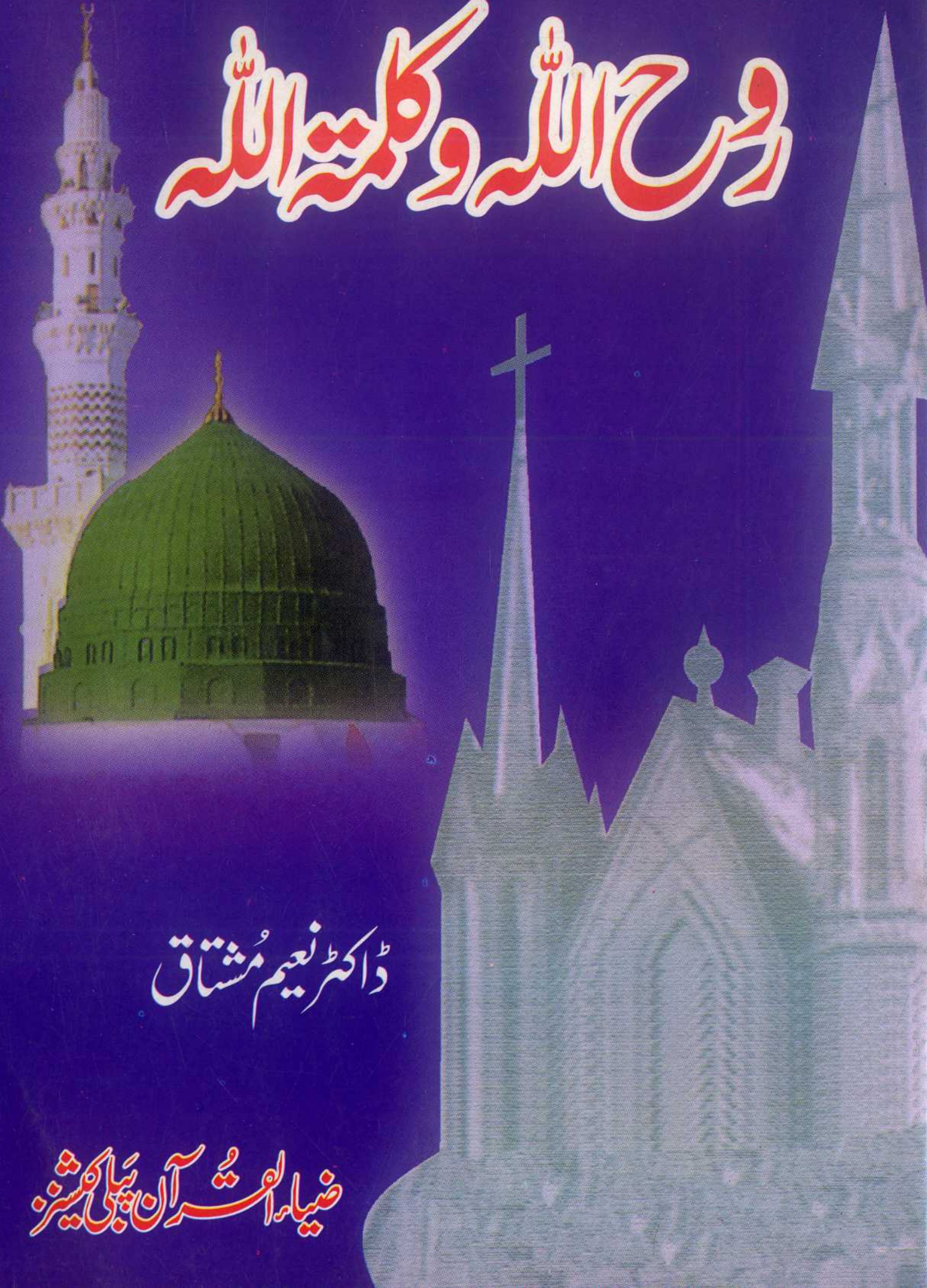
ہم مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ وکلمۃ اللہ کیوں کہتے ہیں؟

روح اللہ وکلمۃ اللہ



ڈاکٹر نعیم مُشتاق

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

روح اللہ و کلمۃ اللہ

مؤلف

ڈاکٹر نعیم مشتاق

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور ○ کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	روح اللہ وکلمۃ اللہ
مصنف	ڈاکٹر نعیم مشتاق
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
تاریخ اشاعت	جنوری2003ء
کمپیوٹر کوڈ	1Z351
قیمت	30 · 00

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350

فیکس:۔042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

مذہبی معاملات پر لب کشائی جہاں خوش بختی کے راستے کھولتی ہے وہاں ذرا سی لغزش پر بدبختی کا باعث بھی بن جایا کرتی ہے جسے دین کا فہم دیا گیا اسے خیر کثیر مل گیا ہر کوئی اس کا اہل نہیں ہوا کرتا۔ نوجوان نعیم مشتاق نے ذہن رسا پایا ہے خلوص، لگن، محنت اور بے لاگ مطالعہ نے دس سال کے اندر اس نوجوان کو اس سطح پر لا کھڑا کیا ہے کہ اس مضمون پر انہیں اتھارٹی کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔ بائبل کے کمزور مقامات انہیں نوکِ زباں ہیں۔ جب تضادات کا ذکر کرتے ہیں تو عیسائی علماء کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔

گفتگو کا انداز منطقی ہوتا ہے جذبات میں آ کر مشتعل نہیں ہوتے۔ دلائل کا جادو دلوں کو مسخر کرتا چلا جاتا ہے۔ اس الحاد و بے دینی اور آزاد خیالی و بے راہ روی کے دور میں نعیم مشتاق کے خیالات تشکیک کی گرد کو صاف کر کے آدمی کو یقین و ایمان کی حسین وادیوں کا مسافر بنا دیتے ہیں۔

پروفیسر محمد رفیق نقشبندی

میر پور۔آزاد کشمیر

محترم نعیم مشتاق صاحب کو اللہ تعالیٰ نے مختلف صلاحیتوں اور خوبیوں سے خوب نوازا ہے بالخصوص تردید عیسائیت میں شباب کے اس عالم میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ذہن رسا کے ساتھ ساتھ فہم و فراست اور اپنے ماضی الضمیر کو دلائل و براہین کے ساتھ بیان کرنے اور دوسروں کو ذہنی و فکری طور پر متاثر کرنے کی صلاحیت اور کمال بھی عطا کیا ہے بات اگرچہ بڑے ہی دھیمے انداز میں کرتے ہیں مگر جب بات ان کے منہ سے نکلتی ہے تو وہ سامع کے دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔

آمین بجاہ سید المرسلین ﷺ

دعا گو

محمد الیاس اعظمی

منہاج انٹرنیشنل یونیورسٹی، لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَہۡلَ الۡکِتٰبِ لَا تَغۡلُوۡا فِیۡ دِیۡنِکُمۡ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الۡحَقَّ ؕ اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ وَ کَلِمَتُہٗ ۚ اَلۡقٰہَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡہُ ۫ فَاٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رُسُلِہٖ ۚ۟ وَ لَا تَقُوۡلُوۡا ثَلٰثَۃٌ ؕ اِنۡتَہُوۡا خَیۡرًا لَّکُمۡ ؕ اِنَّمَا اللّٰہُ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ؕ سُبۡحٰنَہٗۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ لَہٗ وَلَدٌ ۘ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ کَفٰی بِاللّٰہِ وَکِیۡلًا ۔

”اے اہل کتاب نہ غلو کرو اپنے دین میں اور نہ کہو اللہ تعالیٰ کے متعلق مگر سچی بات بے شک مسیح عیسیٰ ابن مریم تو صرف اللہ کے رسول ہیں اور اس کا کلمہ جسے اللہ نے پہنچایا تھا مریم کی طرف اور ایک روح تھی اس کی طرف سے پس ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسولوں پر اور نہ کہو تین (خدا ہیں) باز آجاؤ (ایسا کہنے سے) یہ بہتر ہے تمہارے لئے بے شک اللہ تو معبود واحد ہے پاک ہے وہ اس سے کہ ہو اس کا کوئی لڑکا اسی کا (ملک) ہے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے اور کافی ہے اللہ تعالیٰ کارساز۔“

(سورہ النساء:۱۷۱)

عَنۡ عُبَادَةَ رَضِیَ اللّٰهُ عَنۡهُ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیۡهِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنۡ شَهِدَ اَنۡ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَاشَرِیۡکَ لَهٗ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ وَاَنَّ عِیۡسٰی عَبۡدُاللّٰهِ وَرَسُوۡلُهٗ وَ کَلِمَتُهٗ اَلۡقَاهَا اِلٰی مَرۡیَمَ وَ رُوۡحٌ مِّنۡهُ وَالۡجَنَّةُ حَقٌّ وَّالنَّارُ حَقٌّ اَدۡخَلَهُ اللّٰهُ الۡجَنَّةَ عَلٰی مَاکَانَ مِنَ الۡعَمَلِ قَالَ الۡوَلِیۡدُ حَدَّثَنِیۡ ابۡنُ جَابِرٍ عَنۡ عُمَیۡرٍ عَنۡ جُنَادَةَ وَزَادَ مِنۡ اَبۡوَابِ الۡجَنَّةِ الثَّمَانِیَةِ اَیُّهَا شَآءَ

”عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جس نے یہ گواہی دی کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اور محمد (ﷺ) اس کے بندے اور رسول ہیں، اور عیسیٰ (علیہ السلام) اس کے بندے اور رسول ہیں اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے مریم کو پہنچایا تھا اور اس کی طرف سے ایک جان ہیں اور جنت حق ہے اور دوزخ حق ہے تو اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا جیسے بھی عمل کرتا ہو، ولید نے ابن جابر، عمیر، جناد کے واسطہ سے یہ الفاظ زیادہ کئے ہیں کہ جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس سے وہ چاہے (داخل ہوگا)۔“

(صحیح بخاری، کتاب الانبیاء حدیث نمبر ۶۵۶ ج ۲ صفحہ ۳۰۶)

فہرست عنوانات

انتساب

اپنے والدین کے نام

جن کی اسلام سے محبت پر مبنی خصوصی تربیت نے مجھے مسیحی
مشنریوں کے نفسیاتی اور علمی حربوں سے محفوظ رکھا

اظہارِ تشکر

یہ کتاب کبھی بھی وجود میں نہ آتی اگر مجھے محترم حضرت بابا نور محمد اپنے علم کو تحریر کی قید میں لا کر امت مسلمہ کے حوالے کرنے کا حوصلہ نہ بخشتے۔ آپ کی شخصیت معنی و مفہوم کے سمندر کی مالک ہے۔

اس کے بعد محترم جناب سید ہدایت رسول قادری صاحب کا خصوصی طور پر شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے ردّ قادیانیت کورسز میں ردّ عیسائیت پر میرے خصوصی لیکچرز رکھوائے اور ان لیکچرز کی عوام الناس میں مقبولیت اور ان کے پراصرار زور پر اب ان لیکچرز کو کتابی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ انہیں لیکچرز میں ایک لیکچر "حضرت عیسیٰ کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کیوں کہتے ہیں؟" آپ کے ہاتھوں میں کتابی شکل میں حاضر ہے۔ یہ ساری Motivation محترم سید ہدایت رسول صاحب کی محبت اور شفقت کا نتیجہ ہے اللہ انہیں اور بلند درجات سے نوازے۔ (آمین)

اس کے علاوہ اپنے چھوٹے بھائی صابر حسین اور نہایت عزیز دوست اور خالہ زاد بھائی محمود انور کا بھی خصوصی طور پر مشکور ہوں جنہوں نے اپنی لائبریری سے استفادہ کرنے کی اجازت اور کتابوں کے حصول میں خصوصی تعاون فرمایا۔

ایک اور نہایت شفیق دوست محترم جناب عاصم ملک کا خصوصی طور پر مشکور ہوں جنہوں نے کام کرنے کے لئے نہایت آرام دہ ماحول فراہم کیا جس کے بغیر اس کتاب کی اس تیزی سے تکمیل ممکن نہیں تھی۔

محترم جناب محمد حفیظ البرکات شاہ صاحب اور میجر (ر) محمد ابراہیم شاہ صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جن کے بھرپور تعاون اور علمی ذوق کے بغیر یہ کتاب پایہ تکمیل تک نہ پہنچتی۔ اللہ ان کے عمدہ ذوق اور علم دوستی کے جذبوں کو زندہ رکھے۔ علاوہ ازیں ضیاء القرآن پبلی کیشنز کے دیگر تمام سٹاف کے مثبت رویوں کیلئے بھی مشکور ہوں۔ اللہ تعالیٰ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور کو مزید ترقی سے نوازے۔

اللہ ان سب کو ہمیشہ اپنے سایۂ رحمت میں رکھے۔

(آمین)

اس موضوع پر یہ کتاب کیوں؟

"ہم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ہرگز خدا نہیں مانتے"۔ میں نے پھر اپنا موقف دہرایا۔

"مگر یہ تو آپ کا عقیدہ ہے، جس کی کوئی دلیل آپ کے پاس نہیں۔" پادری صاحب ڈھٹائی سے بولے۔

"مگر میں نے ابھی تو آپ ہی کی بائبل مقدس سے کئی آیات پڑھ کر سنائی ہیں جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا رد اور آپ کی عبدیت و رسالت ثابت ہوتی ہے۔" میں نے پادری صاحب کے رویئے پر حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"اس سے ہمارے عقیدے پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پادری صاحب عجیب شان بے نیازی سے بولے۔ "بائبل مقدس کی آیات کا وہ معنی و مفہوم مراد نہیں جو آپ سمجھتے ہیں آپ نے تو ان آیات میں تحریف معنوی کی ہے۔" پادری صاحب بولتے چلے گئے۔ "عہد نامہ جدید کے مجموعی پیغام کی روشنی میں یسوع کی الوہیت ہی ثابت ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ آپ کا قرآن مجید بھی یسوع کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کہہ کر آپ کی الوہیت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔"

پادری صاحب نے اب گفتگو کا رخ بائبل سے موڑ کر قرآن کی طرف کر دیا۔

"مگر جناب! مسیح کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے وہ معنی نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"سمجھ میں کیوں نہیں آ رہا؟ قرآن صاف اور سیدھی بات کر رہا ہے کہ یسوع اللہ کی روح اور اس کا کلمہ ہے اور اسی بات پر تو ہم مسیحی ایمان رکھتے ہیں۔" پادری صاحب چہک کر بولے۔ انہیں ہماری آواز میں لڑکھڑاہٹ سے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم روح اللہ و کلمۃ اللہ کے معنی و مفہوم پر واضح جواب نہیں رکھتے۔ ہماری کم علمی کے احساس پر وہ اور زیادہ خود اعتماد ہو گئے اور ان کی آواز میں کھویا ہوا رعب واپس آ گیا۔

"مگر آپ کی یہ بات دیگر قرآنی آیات کی روشنی میں درست نہیں۔" میں نے پادری صاحب کی توجہ قرآن کی دوسری آیات کی طرف موڑنے کی کوشش کی۔

"وہ کیسے؟" پادری صاحب بولے

سب لوگ انہماک سے بیٹھے ہماری یہ گفتگو سن رہے تھے۔ ہمارے مسیحی میزبان جن کے گھر پر ہر ہفتہ بائبل سٹڈی کے نام سے یہ محفل منعقد ہوا کرتی تھی، بھی بڑی توجہ سے ہم دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔ محفل میں موجود دیگر مسیحی حضرات جو پہلے پادری صاحب کے دلائل کی کمزوری پر خاصے پریشان نظر آرہے تھے اب ہمیں کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے معنی ومفہوم کی وضاحت پر کمزور پا کر خاصے مطمئن نظر آرہے تھے کیونکہ وہ اپنے ساتھ بعض مسلمان نوجوانوں کو بھی لائے تھے تاکہ پادری صاحب کی تبلیغ کے نتیجے میں عیسائی ہوجائیں ہمارے قوی دلائل کی روشنی میں انہیں اپنی یہ محنت ضائع ہوتی نظر آرہی تھی بہرحال میں نے ایک مرتبہ پھر پادری صاحب کی توجہ روح اللہ و کلمۃ اللہ پر بحث سے ہٹانے کی کوشش کی۔

''قرآن مجید میں واضح طور پر دیگر آیات میں بیان کردیا گیا ہے کہ مسیح کو خدا ماننے والے کافر ہیں۔''میں نے پادری صاحب کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''مگر جناب! اس سے تو قرآن میں تضاد پیدا ہوگیا ایک طرف تو وہ مسیح کو اپنی روح اور کلمہ کہہ کر اس کے خدا ہونے کی تصدیق کررہا ہے تو دوسری طرف اس کی الوہیت کا رد۔'' پادری صاحب بڑے اعتماد اور گرمجوشی سے بولے۔ اگر روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہونے سے وہ مراد نہیں جو ہم مسیحی لیتے ہیں تو پھر قرآن نے ایک بندہ کو اپنی روح اور کلمہ کیوں کہا؟''

''چلئے پادری صاحب! اس پر کسی دوسرے موقع پر گفتگو کریں گے۔ سردست وقت بھی کم ہے اور پھر دوسرے لوگوں کو بھی سوال پوچھنے کا موقع دیا جانا چاہئے۔ میں نے اپنی کم علمی چھپانے کی ایک ناکام کوشش کی۔ تب پادری صاحب ایک معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں مخاطب ہوئے۔ ''چلئے یونہی سہی! مگر کسی اور موقع پر گفتگو تک ہم آج کی گفتگو کے نتیجے میں یہی سمجھیں گے کہ ایک تو قرآن میں تضاد ثابت ہوا، دوسرے مسیح از روئے قرآن بھی خدا ثابت ہوا کیونکہ وہ اس کی روح اور کلمہ ہے۔ یہ بات سن کر محفل میں موجود دوسرے مسیحی مبلغین کے چہروں پر فاتحانہ مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

اس رات جب میں بستر پر سونے کیلئے لیٹا تو طبیعت میں سخت بے چینی کے باعث ساری رات نہ سوسکا۔ بے چینی اور پریشانی اس بات کی نہیں تھی کہ روح اللہ اور کلمۃ اللہ کے معنی پتہ نہ تھے بلکہ اس محفل میں پادری حضرات جن مسلمان نوجوانوں کو تبلیغ مسیحیت کیلئے لائے تھے نجانے ہماری علمی کمزوری سے ان نوجوانوں کے دل ودماغ پر کتنا برا اثر پڑا ہوگا۔ ہماری کم علمی کو انہوں نے

اسلامی تعلیمات کا نقص سمجھ لیا ہوگا اور کہیں ایمان کو برباد نہ کر بیٹھیں ہوں۔ چنانچہ بعد میں پتہ چلا کہ کئی ایک نوجوانوں نے ان محافل میں کثرت کے ساتھ بیٹھنے کے باعث ان گمراہ کن صحبتوں کا اثر لیا اور مسیحیت کو قبول کرلیا۔

اوپر آپ نے پادری صاحب سے میری جو گفتگو پڑھی وہ ایک سچا واقعہ ہے اور 1985ء کی بات ہے۔ یہ وہ دور تھا جب مجھے بازاروں میں تبلیغی کتابچے تقسیم کرنے والے غیر ملکی مشنریوں سے گفتگو کا شوق ہوا اسلامی علوم پر پہلے سے کوئی خاص تربیت نہ تھی لہٰذا یوں Trial & Error سے سیکھتے رہے۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ والدین کی خصوصی تربیت کے باعث اپنی کم علمی کو کبھی ایمان کی خرابی یا اسلامی تعلیمات کا نقص نہیں سمجھا۔

بہرحال اس واقعہ کے بعد ایک بات خوب اچھی طرح ذہن نشین ہوگئی کہ اپنے عقائد و نظریات پر علم حاصل کئے بغیر دوسرے عقائد ونظریات پر مطالعہ کرنا (تقابل ادیان) اور ان کے مبلغین سے بات کرنا ذہنی وفکری پریشانیوں کا باعث بن سکتا ہے۔ اور اگر اپنے عقیدے وایمان کے ساتھ جذباتی تعلق نہ ہو تو انسان عقیدہ سے محروم بھی ہوسکتا ہے۔

بہرحال پادری حضرات یہ دلیل کہ ''قرآن حضرت مسیح کو روح اللہ وکلمۃ اللہ کہہ کر ان کی الوہیت کی تصدیق وتائید کرتا ہے'' اکثر وبیشتر گفتگو میں پیش کرتے ہیں اور ان کی کتب میں بھی آپ کو یہ دلیل اکثر ملے گی۔

ابتداء میں میری اس موضوع پر کوئی تحقیق نہیں تھی لہٰذا اس دلیل کے سامنے آنے پر بہت پریشانی ہوئی۔ ادھر اُدھر سے کتابیں ڈھونڈیں مگر کہیں سے بھی اطمینان بخش مواد نہیں ملا۔ کوئی ایک کتاب یا تفسیر بھی ایسی نظر سے نہیں گزری جو قاری کو بحث ومباحثہ کیلئے مکمل مواد فراہم کرسکے تاکہ قاری علمی سطح پر مختلف سوالات کا جواب دینے کے قابل ہوجائے اور اس موضوع پر اس کا اطمینان قلب دلائل پر مبنی ہو نہ کہ محض عقیدہ کی بنیاد پر اور وہ دوسروں کو بھی یہ اطمینان قلب بصورت دلائل مہیا کرسکے۔

بہرحال بارگاہ نبوت ﷺ سے جو کچھ مجھے ملا وہ اب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اس علم سے فائدہ اٹھائیں اور اسے دوسروں تک محبت اور فراخدلی سے پہنچائیں۔ اسے حاصل کرنے کے بعد دوسروں کے سامنے اپنی علمیت کا رعب نہ جھاڑنا شروع کردیں۔ جیسا کہ ہمارے معاشرے

میں اکثر نام نہاد علماء کا یہی حال ہے۔ اللہ ایسی گندی بیماری سے بچائے (آمین)۔

یہ بات بھی ذہن نشین رکھئے گا کہ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو صریحاً کہیں بھی ''روح اللہ'' اور ''کلمۃ اللہ'' نہیں کہا گیا یعنی یہ الفاظ آپ کے لئے کہیں نہیں آئے۔ روح اللہ کے الفاظ پورے قرآن میں صرف دومرتبہ سورہ یوسف کی آیت 82 میں آئے ہیں اور وہاں بھی ان سے مراد رحمت الٰہی ہے مسیح کی ذات مراد نہیں۔ قرآن نے آپ علیہ السلام کو ''روح منہ'' اور ''کلمتہ'' کہا اور ان الفاظ کی بنیاد پر ہم آپ کو روح اللہ اور کلمۃ اللہ کہتے ہیں۔

اس کتاب میں ہم نے سورۃ النساء کی آیت 171 کے الفاظ (كَلِمَتُهُ) اور (رُوْحٌ مِّنْهُ) کے معنی ومفہوم پر اکتفا کیا ہے۔ یعنی یہ صرف ان قرآنی الفاظ کی تفسیر پر مبنی کتاب ہے۔ اسے میں نے مختلف عنوانات کے تحت اس طرح واضح کیا ہے کہ انشاء اللہ اس موضوع پر اب یہ کتاب عربی اردو، انگریزی زبانوں میں پہلی کتاب ہوگی اور ان الفاظِ قرآنی کی تفسیر سے قبل میں نے بطور مقدمہ دو نہایت اہم باتیں ذکر کیں ہیں یہ مقدمہ بھی انشاءاللہ بہت سی غلط فہمیوں کے دور کرنے کا سبب بنے گا۔

میں امید کرتا ہوں کہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ عیسائی پادریوں کے روح اللہ اور کلمۃ اللہ سے استدلال پر پریشان نہیں ہوں گے اور انشاء اللہ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد آپ کا اسلام پر عقیدہ مزید پختہ ہوگا اور ہمارے اسلاف کی علم کی گہرائی کے بھی مزید معترف ہوں گے۔

اللہ اور اس کے محبوب رسول ﷺ کی بارگاہ میں دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو مقبول عام بنائے۔ اور میرے والدین اور میری شفاعت کا ذریعہ بھی (آمین)

کتاب کے متعلق مجھے اپنی تجاویز اور مشوروں سے ضرور نوازیئے گا۔

ڈاکٹر نعیم مشتاق، لاہور

E-mail:- topperformance2000@yahoo.com

topperformance@hotmail.com

مقدمہ

پہلی بات: مجاز اور حقیقت میں فرق

اگر آپ دنیا کے تمام مذاہب کی مقدس کتب کا مطالعہ کریں تو آپ کو ان کتب کے اندر اور ان کے بانیوں کے کلام میں بے شمار ایسے جملے اور الفاظ ملیں گے کہ اگر ہم ان کو مجازی معنی میں نہ لیں اور صرف ظاہری معنی ہی کو حقیقی معنی تصور کر لیں تو ان کا پیغام عقلی ونقلی تضادات کا مجموعہ بن جائے گا۔

چنانچہ ایسے الفاظ اور جملوں کو مختلف نسبتوں سے منسوب کر کے معنی متعین کیا جاتا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر دنیائے مذہب کے تمام اہل عقل و دانش کا اتفاق ہے۔ انبیا علیہم السلام کے کلام میں اگر حقیقت اور مجاز کے مابین فرق قائم نہ رکھا جائے تو ان کے پیغام کا اصل مفہوم فوت ہو جائے گا۔ آیئے اس تصور کو قرآن مجید اور بائبل مقدس کی چند مثالوں سے سمجھیں۔

پہلی مثال

بائبل مقدس کی پہلی کتاب پیدائش کے باب اول کی آیت 26 میں باری تعالیٰ کا قول انسان کی تخلیق کے حوالے سے یوں درج ہے کہ

''پھر خدا نے کہا کہ ہم انسان کو اپنی صورت پر اپنی شبیہ کی مانند بنائیں گے۔''

عربی تراجمین نے اس کا عربی ترجمہ یوں کیا ہے۔

''ثُمَّ قَالَ اللّٰهُ: لِنَصْنَعِ الْإِنْسَانَ عَلٰى صُوْرَتِنَا۔''

پھر اسی آیت میں آگے یوں درج ہے کہ

''اور خدا نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا، خدا کی صورت پر اس کو پیدا کیا۔''

عربی ترجمہ مطبوعہ 1995ء میں یوں ہے۔

''فَخَلَقَ اللّٰهُ الْإِنْسَانَ عَلٰى صُوْرَتِهِ، عَلٰى صُوْرَةِ اللّٰهِ خَلَقَهُ''

(پیدائش باب 1 آیت 26)

کتاب پیدائش کی اس آیت کے معنی و مفہوم کے حق میں ایک حدیث نبوی ﷺ بھی آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں۔

"فان الله خلق آدم علی صورته"

"اللہ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا۔" (متفق علیہ)

اب اگر بائبل مقدس کی آیت اور حدیث نبوی ﷺ کے ظاہری معنی کو ہی حقیقی معنی تصور کرتے ہوئے یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ بھی انسان کی طرح شکل وصورت رکھتا ہے تو یہودیت مسیحیت اور اسلام کا تصور توحید تو کلیۃً ختم ہو جائے گا۔

اگر اگر کوئی یہاں مجازی اور حقیقی معنی کے درمیان فرق کو قائم نہ رکھے اور نہ مانے تو یہ اس کی جہالت اور کم علمی کی علامت ہوگی۔ چنانچہ ہم اس کے ظاہری معنی کو رد کرتے ہوئے اس کی تفسیر یہ کریں گے کہ بائبل کی اس آیت اور حدیث نبوی میں اضافت تشریف ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی طرف انسان کی تخلیق کی نسبت کرنے میں انسان کی دیگر مخلوقات پر فضیلت و عظمت کا اظہار مقصود ہے۔

چنانچہ اس حدیث نبوی ﷺ کی شرح کرتے ہوئے حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ لکھتے ہیں۔

"اللہ کی طرف صورت کی نسبت تشریف و تکریم کے لیے ہے جیسے نَفَخْتُ مِنْ رُّوْحِیْ میں ہے۔" (اشعۃ اللمعات ج4 ص605)

کسی آیت کے ظاہری معنی کو چھوڑنے کے لیے کسی دلیل کا ہونا بہت ضروری ہے۔ کتاب پیدائش کی آیت میں انسان کی صورت کی نسبت اللہ کی طرف حقیقی معنی کے رد پر یسعیاہ نبی کا یہ کلام دلالت کرتا ہے۔

"پس تم خدا کو کس سے تشبیہ دو گے؟ اور کونسی چیز اُس سے مشابہ ٹھہراؤ گے؟"

(یسعیاہ 18:40)

اور حدیث نبوی ﷺ کے ظاہری معنی بھی اس آیت قرآنی کی رو سے مراد نہیں لیے جاسکتے۔

"لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ" (شوریٰ آیت 11)

دوسری مثال

آیئے اب ایک اور مثال سے اسی تصور کو سمجھیں۔ بائبل مقدس کی تعلیمات کے مطابق خدا کی ذات کبھی دیکھی نہیں جاسکتی۔ چنانچہ یوحنا اپنی انجیل میں لکھتا ہے۔

"خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔" (انجیل یوحنا 18:1)

پولس رسول تیمتھیس کے نام اپنے پہلے خط میں لکھتا ہے۔

"نہ اسے کسی انسان نے دیکھا اور نہ دیکھ سکتا ہے۔" (1۔ تیمتھیس 16:6)

ایک اور مقام پر یوحنا اپنے پہلے خط میں لکھتا ہے۔

"خدا کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا۔" (1۔ یوحنا 12:4)

ان آیات سے یہ بات تو ثابت ہوگئی کہ جو دیکھا جاسکتا ہے وہ کبھی خدا نہیں ہوسکتا۔ اگر خدا کے کلام میں یا نبیوں اور حواریوں کے کلام میں کسی پر خدا کے لفظ کا اطلاق کیا گیا ہو تو محض لفظ "خدا" کے اطلاق سے کسی کو دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ اس موقع پر حقیقی معنی کو چھوڑ کر مجازی معنی اس لئے جائیں گے کہ کلام کے اندر کچھ ایسی علامتیں پائی جارہی تھیں جن کی بنیاد پر حقیقی معنی مراد نہیں لیے جاسکتے تھے، بالخصوص جب حقیقی معنی کے امکان کے نہ ہونے پر عقلی نقلی دلائل بھی موجود ہوں چنانچہ ایسے الفاظ اور جملوں کو مختلف نسبتوں سے منسوب کر کے معنی متعین کیا جاتا ہے مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کتاب خروج میں لکھا ہے۔

"پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا دیکھ میں نے تجھے فرعون کے لیے گویا خدا ٹھہرایا اور تیرا بھائی ہارون تیرا پیغمبر ہوگا۔" (خروج 1:7)

ایک دوسرے مقام پر یوں ذکر ہے۔

"اور وہ تیری طرف سے لوگوں سے باتیں کرے گا اور وہ تیرا منہ بنے گا اور تو اس کے لیے گویا خدا ہوگا۔" (خروج 16:4)

ان دونوں آیات میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر لفظ "خدا" کا اطلاق کر دیا گیا ہے۔ اب اگر یہاں حقیقت اور مجاز کے مابین فرق کو قائم نہ رکھا جائے تو انہیں آیات سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ہم یہاں عقل و دانش کا طریقہ اپناتے ہوئے لفظ "خدا" سے حقیقی معنی مراد نہیں لیں گے بلکہ کہیں گے کہ یہاں اضافت تشریف ہے اور یہ لفظ یہاں مجازی معنی میں آیا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ نکتہ یہ بھی ہے کہ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تمام انبیاء کرام میں افضل ترین مانتے ہیں اور ان سے محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ مگر بائبل کے انہیں الفاظ سے استدلال کر کے انہیں خدا نہیں بنا دیتے۔ اس "عقلمندی" کا شرف صرف مسیحیوں کو ہی حاصل ہے

اور پھران پادریوں کا ذہن قرآن میں مسیح علیہ السلام کو رُوحٌ مِّنۡهُ کہنے سے فوراً ان کی الوہیت کی طرف جاتا ہے مگر بائبل میں حضرت موسیٰ کو خدا کہنے سے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی الوہیت پر دھیان کیوں نہیں کرتے؟

ہمارے نزدیک جس طرح بائبل کی ان آیات سے حضرت موسیٰ کی الوہیت پر استدلال کرنا حماقت ہے اور عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے اسی طرح رُوحٌ مِّنۡهُ کے لقب سے مسیح کی الوہیت کو ثابت کرنا بھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف منسوب کتاب زبور میں تو انتہا کردی گئی ہے۔

''میں نے کہا تھا تم الٰہ ہو اور تم سب حق تعالیٰ کے فرزند ہو۔'' (زبور 6:82)

اس آیت میں تو ''الٰہ'' کا اطلاق تمام انسانوں پر کردیا گیا ہے چہ جائیکہ خواص۔ اب اگر ہم پادری صاحبان کی تفسیر کی روشنی میں اس آیت کو سمجھیں تو سب کا خدا ہونا ہی سمجھ میں آتا ہے۔

پولس رسول فلپیوں میں لکھتا ہے۔

''ان کا انجام ہلاکت ہے، ان کا خدا پیٹ ہے، وہ اپنی شرم کی باتوں پر فخر کرتے ہیں۔ اور دنیا کی چیزوں کے خیال میں رہتے ہیں۔'' (فلپیوں 19:3)

اس آیت میں تو پولس نے پیٹ پر لفظ ''خدا'' کا اطلاق کردیا ہے۔

اس گفتگو سے ہم جو نکتہ ثابت کرنا چاہ رہے ہیں وہ صرف اتنا ہے کہ اگر کسی ایسی چیز پر لفظ ''خدا'' کا اطلاق کردیا جائے جس کا فانی، عاجز، اور متغیر ہونا ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے تو محض اس پر لفظ ''خدا'' کے اطلاق سے کسی ہوش مند کو یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ فانی چیز خدا یا خدا کا بیٹا یا روح اللہ ہوگئی۔

یوحنا کی تحریروں میں تو مجاز کا استعمال بڑی فراخدلی سے ہوا ہے۔ مثلاً ان آیات کو پڑھئے۔
یہ ایسی آیات ہیں جن کے ظاہری معنی تو خود عیسائی پادری اور علماء بھی مراد نہیں لیتے۔

''جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا تخم اس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔'' (1۔یوحنا 9:3)

عربی ترجمہ مطبوعہ بیروت میں یوں ہے۔

كُلُّ مَوْلُودٍ لِلّٰهِ لَا يَفْتَرِفُ الْخَطِيئَةَ لِأَنَّ فِيهِ زَرْعَهُ: لَا يَسَعُهُ أَنْ

يَخْطَأَ وَهُوَ مَوْلُودٌ لِلّٰهِ

لیجئے جناب! اب اگر مجاز اور حقیقت کے مابین فرق کو تسلیم نہ کیا جائے تو اس آیت کے ظاہری معنی تو آپ کی سمجھ میں آگئے ہوں گے۔ چند مزید آیات ملاحظہ فرمائیں۔

''جو کوئی اقرار کرتا ہے کہ یسوع خدا کا بیٹا ہے خدا اس میں رہتا ہے اور وہ خدا میں۔'' (1۔یوحنا 15:4)

''جس کا یہ ایمان ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔......'' (1۔یوحنا 1:5)

ان آیات کے مجازی معنی لینے کے سوا کوئی دوسرا راستہ موجود نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک ان تمام آیات میں اضافت تشریف ہے یعنی نیک اور متقی پرہیزگار بندوں کی دیگر بندوں سے فضیلت نمایاں کرنے کے لیے یوحنا نے ایسا طرز تحریر اپنایا ہے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے کلام میں بھی مجاز کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔ مثلاً ایک یہودی عالم سے آپ نے فرمایا۔

''......جب تک کوئی نئے سرے سے پیدا نہ ہو خدا کی بادشاہی کو دیکھ نہیں سکتا۔'' (انجیل یوحنا 3:3)

مسیح کے اس قول کا بھی ظاہری وحقیقی معنی مراد نہیں لیا جاسکتا۔ لہٰذا ان الفاظ کے مجازی معنی ہی مراد لینے پڑیں گے یعنی نئے سرے سے پیدا ہونے سے مراد جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہے یعنی توبہ کرنے اور مسیح پر ایمان لانے سے انسان کے پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور وہ روحانی طور پر بالکل ایسے پاک ہوجاتا ہے جیسے ابھی پیدا ہوا ہو۔ یہاں بھی اگر حقیقت اور مجاز کے مابین تمیز نہ رکھی جائے تو مسیح کے کلام کے مطابق تو پھر کوئی بھی خدا کی بادشاہی میں شامل نہیں ہوسکتا۔

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ اگر اللہ اور اس کے نبی کے کلام کو پڑھتے وقت مجاز اور حقیقت کے فرق کو مدنظر نہ رکھا جائے تو یہی کلام جو سراسر ہدایت اور نور ہوتا ہے انسان کی گمراہی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

دوسری بات: دنیائے تفسیر کا متفقہ اصول

دنیا کے تمام مذاہب کے علم التفسیر میں ایک اصول ایسا ہے کہ اس کے حق ہونے اور اس کی

ضرورت و اہمیت پر دنیائے تفسیر میں کبھی بھی اختلاف نہیں رہا۔ وہ یہ کہ جب بھی آپ کسی آیت یا لفظ کا معنی و مفہوم سمجھنا چاہیں تو کتاب کی دوسری آیات اور پوری کتاب کی تعلیمات کی روشنی میں سمجھیں۔ اس اصول کو اپنانے سے گمراہی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ عقلی تقاضا بھی یہی ہے وگرنہ تو مذہب ایک مذاق بن کر رہ جائے گا۔ اس طرح تو ہر کوئی کسی نہ کسی آیت سے اپنے لیے علیحدہ مذہب، فرقہ نکال لے گا۔ باطل فرقوں کے وجود میں آنے کی بھی یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ اپنے نکتہ نظر کی تائید میں چند مخصوص آیات تلاش کر لیتے ہیں اور کتاب کے مجموعی پیغام اور دیگر آیات اور سیاق و سباق کی روشنی میں اپنے نقطہ نظر کو نہیں پرکھتے اور یہی طریقہ گمراہی کا سبب بنتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ۔" (سورۃ بقرہ آیت 26)

"گمراہ کرتا ہے اللہ اس سے بہتیروں کو اور ہدایت دیتا ہے اس سے بہتیروں کو۔"

گمراہی قرآن سے نہیں ملتی بلکہ گمراہی تو انسان کی نیت میں موجود ہوتی ہے۔ اپنی ذہنیت گندی ہو اور خواہش نفس ہی مقصد حیات ہو تو ایسی جگہ پر اللہ کے کلام کا فیض نہیں ٹھہرتا۔ فیض حاصل کرنے کے لیے نیت کی درستگی، دل کا اخلاص اور درست طریقہ مطالعہ بہت ضروری ہے۔

چنانچہ اہل عقل و دانش خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو ہمیشہ کتاب کے مجموعی پیغام اور آیات کے سیاق و سباق کو مدنظر رکھ کر ہی کسی آیت یا لفظ کا معنی و مفہوم متعین کرتے ہیں۔ علم التفسیر کے اس مسلمہ اصول پر اسلام اور مسیحیت کے علماء میں کوئی اختلاف نہیں۔

آیئے اس اصول کی اہمیت کو بائبل مقدس کے چند حوالوں کی روشنی میں سمجھیں۔

پطرس حواری ایک موقع پر بڑی دلچسپ بات کہتا ہے۔

"جن کے باعث اس نے ہم سے قیمتی اور نہایت بڑے وعدے کیے تا کہ ان کے وسیلہ سے تم اس خرابی سے چھوٹ کر جو دنیا میں بری خواہش کے سبب سے ہے ذات الٰہی میں شریک ہو جاؤ۔" (2۔پطرس 4:1)

اب اگر کوئی شخص آیت کے صرف اس حصہ "ذات الٰہی میں شریک ہو جاؤ" کو پکڑ لے اور دعویٰ کرنے لگے کہ بائبل مقدس توحید کی بجائے شرک کی تعلیم دیتی ہے کیونکہ ذات الٰہی میں شرکت کا دعویٰ ہی تو شرک ہے۔ حالانکہ اس شخص کا یہ دعویٰ بائبل مقدس کی اس دوسری آیت سے

غلط ٹھہرے گا۔

"...... میں خداوند سب کا خالق ہوں۔ میں ہی اکیلا آسمان کو تاننے اور زمین کو بچھانے والا ہوں۔ کون میرا شریک ہے؟ (یسعیاہ 24:44)

عقیدہ اگر شرک کا ہو تو پھر انسان پطرس کے قول کی توجیہ کرنے کی بجائے اسے لغوی معنی پر رکھے گا۔ اور یسعیاہ کی عبارت کی وضاحت کرنے کی احمقانہ کوشش کرے گا۔ ایسا کرنا علمائے اسلام اور مسیحیت دونوں کے ہی نزدیک حماقت ٹھہرے گی اس لیے کہ یہ عقل سلیم اور بائبل مقدس کی رد شرک اور توحید کے حق میں بے شمار دوسری آیات کے خلاف ہے۔

مگر ایسا ہی برمبنی حماقت طرز تحقیق ہمارے پادری حضرات رُوْحٌ مِّنْهُ کے متعلق اپناتے ہیں۔ رُوْحٌ مِّنْهُ سے مسیح کی الوہیت ثابت کرتے وقت اسی آیت کا سیاق و سباق اور قرآن مجید کی ردالوہیت مسیح پر دیگر آیات نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ان پادری حضرات کا یہی غیر منطقی اور جذباتی طرز تحقیق اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب کے اہل علم کی نظروں میں بھی ان کی اپنی بدنامی کا باعث ہے۔

لہٰذا درست تفسیر یہی ہوگی کہ ہم پطرس کے قول کی توجیہہ یوں کریں کہ "ذات الٰہی میں شریک ہو جاؤ" میں مجاز ہے یعنی ذات الٰہی سے مراد پیغام الٰہی ہے اور شرکت سے مراد اس کو یوں عملاً قبول کر لینا ہے کہ انسان اس پیغام کا عملی نمونہ بن جائے۔ چنانچہ آیت کا معنی یوں بھی کیا جا سکتا ہے کہ اللہ کے پیغام کا زندہ عملی نمونہ بن جاؤ اسی کے رنگ میں رنگ جاؤ۔ اور یسعیاہ کے کلام کو ظاہری اور حقیقی معنی پر ہی لیں گے۔

اب اس اصول کو ذہن میں رکھ کر ہماری یہ بات سمجھیں کہ پادری حضرات جو رُوْحٌ مِّنْهُ سے حضرت مسیح کی الوہیت کو ثابت کرتے ہیں تو کیا وہ قرآن مجید کے مجموعی پیغام اور دیگر آیات کی روشنی میں درست بھی ہے یا نہیں۔

ہمارے نزدیک اسی آیت کے دیگر الفاظ مسیح کی الوہیت کا رد کرتے ہیں۔ مثلاً یا اھل الکتاب لا تغلوا فی دینکم میں پادری حضرات کے اسی عقیدہ الوہیت مسیح اور تثلیث فی التوحید کی طرف اشارہ ہے یعنی تم اپنے اعتقادات میں حد سے مت بڑھو۔ اللہ کی بیان کردہ حقیقت میں اپنی طرف سے کچھ اور نہ ملاؤ۔ اللہ نے جب مسیح علیہ السلام کو اپنا بندہ اور رسول بنایا ہے تو تم

اسے خدامت بناؤ۔ پھر ولاتقولو ثلثہ کہہ کرفرمایا کہ عقیدہ الوہیت مسیح کی طرح عقیدہ تثلیث فی التوحید بھی باطل ہے جو الوہیت مسیح کے عقیدہ کی بنیاد ہے۔ اور پھر اسی آیت میں آگے چل کر مسیح علیہ السلام کی عبدیت ورسالت کی تصدیق کردی۔ علاوہ ازیں مسیح کی الوہیت کو کئی ایک مقامات پر قرآن نے رد کردیا ہے۔ مثلاً

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ

''یقیناً کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ تو مسیح بن مریم ہی ہے۔'' (مائدہ:17)

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ ۚ يُضَاهِــــُٔـوْنَ قَوْلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَبْلُ ۭ قٰتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ (توبہ:30)

''اور کہا یہود نے کہ عزیز اللہ کا بیٹا ہے اور کہا نصرانیوں نے کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ان کی (بے سروپا) بات ہے ان کے مونہوں سے نکلی ہوئی نقل اتار رہے ہیں ان لوگوں کے قول کی جنہوں نے کفر کیا پہلے ہلاک کرے انہیں اللہ تعالیٰ، کدھر بھٹکے چلے جارہے ہیں۔''

اور نصرانی بولے مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔''

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ

(مائدہ:72)

''بے شک کافر ہوگئے وہ جنہوں نے (یہ) کہا کہ اللہ مسیح بن مریم ہی تو ہے۔''

قرآن مجید نے اپنی ان آیات سے پادری حضرات کی اس تفسیر کو رد کردیا کہ حضرت مسیح کو (وَرُوْحٌ مِّنْهُ) کہنے سے قرآن ان کی الوہیت کی طرف متوجہ کررہا ہے۔ اب حضرت مسیح علیہ السلام کو وَرُوْحٌ مِّنْهُ اور كَلِمَتُهٗ اللہ کیوں کہا اور ان القابات سے کیا مراد ہے وہ بحث اب آگے تفصیل سے آرہی ہے مگر ان سے وہ معنی ہرگز مراد نہیں جو پادری حضرات لیتے ہیں۔

رُوْحٌ مِّنْهُ میں روح سے کیا مراد ہے

روح کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنی میں آیا ہے مثلاً

روح بمعنی رحمت: وَلَا تَايْــــَٔـسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ (یوسف:87)

روح بمعنی فرشتہ: نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ (الشعرآ:193)

روح بمعنی نصرت وحمایت: وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ:22)

روح بمعنی انسانی جان: وَيَسْــَٔـلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ (بنی اسرائیل:85)

روح بمعنی وحی الٰہی: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا (الشوریٰ:52)

اس آیت میں رُوْحٌ مِّنْهُ میں روح سے مراد انسانی جان ہے اور مضاف محذوف ہے۔ یعنی ''ذوروح منہ'' تفسیر جلالین میں ایسا ہی ہے۔ اور تفسیر بیضاوی میں ہے۔

"وذوروح صدر منه لا بتوسط ما يجرى مجرى الاصل والمادة له"

ایسی روح والا جو اس سے بغیر کسی مادہ اور اصل کے صادر ہوئی۔

(تفسیر بیضاوی، صفحہ ۱۳۷)

بہرحال کلام الٰہی میں کسی مخلوق کے حق میں ''میری روح'' یا اس کی (اللہ) روح کے الفاظ بائبل مقدس وقرآن میں عام آئے ہیں۔ اس طرز خطاب میں صرف اضافت تشریف ہے۔ رُوْحٌ مِّنْهُ میں روح سے مراد اللہ کی ذات لینا اور پھر اس کی تفسیر یہ کرنا کہ حضرت مسیح علیہ السلام خود اللہ ہیں بالکل لغو اور باطل بات ہے۔ لیکن پھر بھی اگر کوئی پادری صاحب الوہیت مسیح کے رد میں واضح آیاتِ قرآنی کی موجودگی میں بھی اسی تفسیر اور طرز استدلال پر اصرار کریں تو پھر اس معاملہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی خصوصیت باقی نہیں رہتی۔ آیئے ذرا پادری حضرات کے اسی طرز استدلال کو اپنا کر دیکھیں کہ اب قرآن مجید اور بائبل مقدس کی روشنی میں کون کون روح اللہ اور اللہ ٹھہرتا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے حق میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ

''تو جب میں اسے درست فرمادوں اور پھونک دوں اس میں خاص روح اپنی

طرف سے تو گر جانا اس کے سامنے سجدہ کرتے ہوئے۔" (حجر:29)

لیجئے! ان آیات کے مطابق حضرت آدم میں اللہ نے اپنی روح پھونکی۔ اب تو مسیحی تفسیر کو مدنظر رکھیں تو حضرت آدم بھی "روح اللہ" ٹھہرے۔

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِن رُّوحِي فَقَعُوا لَهُ سَاجِدِينَ

"پس جب میں اس کو سنوار دوں اور پھونک دوں اس میں اپنی (طرف سے خاص) روح تو تم گر پڑنا اس کے آگے سجدہ کرتے ہوئے۔" (ص:72)

اور پھر حضرت آدم علیہ السلام ہی کیا۔ ایک اور آیت قرآنی کی رو سے تو تمام انسان خواہ اچھے ہوں یا برے خدا ٹھہرتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (سجدہ:9)

"پھر اس (کے قد وقامت) کو درست فرمایا اور پھونک دی اس میں اپنی روح اور بنا دیئے تمہارے لئے کان، آنکھیں اور دل۔ تم لوگ بہت کم شکر بجالاتے ہو"

اس آیت کی رو سے تو تمام انسانوں کے وقت تخلیق اللہ ان میں اپنی روح پھونکتا ہے۔ قرآن مجید کی اس آیت کے معنی ومفہوم کی تصدیق بائبل مقدس کی ان دو آیات سے بھی ہوتی ہے۔

"تو ان کا دم روک لیتا ہے اور یہ مر جاتے ہیں اور پھر مٹی میں مل جاتے ہیں تو اپنی روح بھیجتا ہے اور یہ پیدا ہوتے ہیں۔" (زبور ۱۰۴:۲۹,۳۰)

"اگر وہ اپنی روح اور اپنے دم کو واپس لے لے تو تمام بشر اکٹھے فنا ہو جائیں گے اور انسان پھر مٹی میں مل جائے گا۔" (ایوب ۳۴:۱۴,۱۵)

ان دو آیات سے بھی قرآن کی مندرجہ بالا آیت کے معنی ومفہوم کی تصدیق ہوگئی کہ ہر انسان میں اللہ کی روح موجود ہے لہذا اب ہر کوئی "روح اللہ" ہے۔ ہمارا یہ کہنا الزامی ہے۔ ہمارے نزدیک تو ان مقامات پر روح سے مراد انسانی جان ہے اور اس کی نسبت خدا نے اپنی طرف اس لیے کی تاکہ اس کا اشرف المخلوقات ہونا اس طرز خطاب سے واضح ہو جائے۔ اپنی اس تخلیق کو دوسری مخلوقات کی تخلیق سے نمایاں کرنے کے لیے ایسا طرز کلام اختیار فرمایا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔

"کاش خداوند کے سب لوگ نبی ہوتے اور خداوند اپنی روح ان سب میں ڈالتا۔" (گنتی 11:29)

لیجئے! حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس خطاب کی روشنی میں تو اب صریحاً واضح ہو گیا کہ حضرت مسیح علیہ السلام ہی کیا، اللہ کا ہر نبی "روح اللہ" ہوتا ہے۔ اب اگر پادری صاحبان کی تفسیر اور طرز استدلال اختیار کیا جائے تو سلسلہ انبیاء کا ہر نبی مرتبہ الوہیت پر فائز ہو گیا۔

کتاب پیدائش میں فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کے متعلق اپنے درباریوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے۔

"سو فرعون نے اپنے خادموں سے کہا کیا ہم کو ایسا آدمی جیسا یہ ہے جس میں خدا کی روح ہے مل سکتا ہے؟ (پیدائش ۴۱:۳۸)

اور عربی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۹۵ میں یوں ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ لِعَبِيدِهِ: "هَلْ نَجِدُ نَظِيرَ هَذَا رَجُلًا فِيهِ رُوحُ اللهِ؟"

اتنی عقل تو فرعون کے خادموں کو بھی تھی کہ جب فرعون نے حضرت یوسف علیہ السلام کو روح اللہ کہا تو اس سے مراد یہ نہیں تھا کہ فرعون حضرت یوسف علیہ السلام کی الوہیت کا قائل ہے۔ انہیں پتہ تھا کہ یہ اطلاق مجازاً ہے چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام جیسا کوئی دانشور اور عقلمند اس وقت اور کوئی نہ تھا اس لیے فرعون نے انہیں مجازاً روح اللہ کہا جیسا کہ اس اگلی آیت سے پتہ چلتا ہے۔

"اور فرعون نے یوسف سے کہا چونکہ خدا نے تجھے یہ سب کچھ سمجھا دیا ہے اس لیے تیری مانند دانشور اور عقلمند کوئی نہیں۔" (آیت ۳۹)

بیلشضر بادشاہ جب ایک غیبی نوشتہ کی تعبیر سے عاجز آ گیا اور اس دور کے تمام نجومی اور فال گیر بھی عاجز آ گئے تو وہ اس حد تک گھبرایا کہ اس کے چہرہ کا رنگ اڑ گیا اور سب لوگ بادشاہ کی پریشانی دیکھ کر خود بھی پریشان ہو گئے۔ اس پر اس کی والدہ کو پتہ چلا تو وہ اسی وقت اس کے پاس آئی اور اسے دانی ایل نبی کی خبر یوں دی۔

"......اے بادشاہ ابد تک جیتا رہ۔ تیرے خیالات تجھ کو پریشان نہ کریں اور تیرا چہرہ متغیر نہ ہو، تیری مملکت میں ایک شخص ہے جس میں قدوس الہوں کی روح ہے......" (دانی ایل ۵:۱۰-۱۱)

بادشاہ کے بلانے پر جب دانی ایل نبی دربار میں تشریف لائے تو بیلشضر بادشاہ آپ سے یوں مخاطب ہوا۔

''میں نے تیری بابت سنا ہے کہ الٰہوں کی روح تجھ میں ہے۔'' (دانی ایل 12:5)

ان آیات میں بھی اگر ہم پادری صاحبان کی ''عقلمندی'' کی پیروی کریں تو حضرت دانی ایل نبی کا مرتبہ الوہیت پر فائز ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ مگر نہ تو بیلشضر بادشاہ، اس کی رعایا، اور اس کی والدہ نے ایسا سوچا۔ سب اس حد تک سمجھدار ضرور تھے کہ کسی شخص میں اللہ کی روح کے پائے جانے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ شخص اللہ سے دوسروں کی نسبت زیادہ قربت رکھتا ہے۔ سب جانتے تھے کہ حضرت دانی ایل اپنے دور کے تمام لوگوں سے زیادہ باصلاحیت تھے اس حد تک کہ عقل انسانی اس کا احاطہ کرنے سے عاجز تھی اس لیے مجازاً آپ کے متعلق کہا جاتا تھا کہ آپ میں ''مقدس الٰہوں کی روح'' ہے۔ اور اس کے اطلاق کی یہ وجہ بھی ہمیں کتاب دانی ایل ہی کے باب 5 میں مل جاتی ہے۔

''کیونکہ اس میں ایک فاضل روح اور دانش اور عقل اور خوابوں کی تعبیر اور عقدہ کشائی اور حل مشکلات کی قوت تھی۔'' (آیت 12)

بہرحال ایسا طرز کلام بائبل میں عام ہے۔ دانی ایل نبی نے بھی اپنی ذات پر اس کے اطلاق کا برا نہیں منایا کیونکہ علم رکھتے تھے کہ یہ عزت واحترام سے نوازنے کا ایک محض انداز ہے۔ ان کی خوش قسمتی تھی کہ ان کے دور میں ہمارے آج کے پادری حضرات موجود نہیں تھے ورنہ آپ کی الوہیت کی تبلیغ شروع کر دیتے۔

اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ سے بضلی ایل بن اوری کے متعلق فرماتے ہیں۔

''اور میں نے اس کو حکمت اور فہم اور علم اور ہر طرح کی صنعت میں روح اللہ سے معمور کیا ہے۔'' (خروج 2:31)

اور عربی ترجمہ مطبوعہ 1995ء میں ہے۔

وَمَلَأْتُهُ مِنْ رُوحِ اللّٰهِ وَوَهَبْتُهُ حِكْمَةً وَمَهَارَةً وَمَقْدِرَةً وَمَعْرِفَةً فِيْ كُلِّ أَنْوَاعِ الْحِرَفِ۔

لیجئے! یہ ہمارے موضوع سے متعلق پوری بائبل میں دلچسپ ترین آیت ہے۔ اس لیے کہ جس

یسوع مسیح علیہ السلام کی الوہیت کی تبلیغ کرتے پادری حضرات تھکتے نہیں ان کے حق میں تو بائبل کے کسی بھی مقام پر صریحاً اس طرح ''روح اللہ'' کے الفاظ نہیں آئے، اور اگر آئے بھی تو اس یہودی قبیلہ کے ایک ماہر کاریگر کے حق میں۔ مگر ساتھ ہی اس آیت میں شخص پر روح اللہ کے اطلاق کی وجہ بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اسے حکمت، فہم اور علم میں عام افراد سے زیادہ کمال بخشتا تھا۔

ان ہزاروں انسانوں سے خطاب کرتے ہوئے جن کو اللہ تعالیٰ نے حضرت حزقی ایل کے معجزہ سے زندہ کر دیا تھا اللہ کا ارشاد اس طرح مذکور ہے۔

''اور میں اپنی روح تم میں ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گے۔'' (حزقی ایل 14:37)

اس عبارت پر بھی وہی تبصرہ ہے جو ہم پچھلی عبارات میں کر چکے ہیں۔

آیئے اب مسیحیوں کے نزدیک مسیح علیہ السلام کے بعد سب سے معتبر ترین شخصیت پولس رسول کے چند فرمودات پر غور کرتے ہیں۔ پولس حواریوں کے حق میں کہتا ہے۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ تم خدا کا مقدس ہو اور خدا کا روح تم میں بسا ہوا ہے۔'' (1۔کرنتھیوں 16:3)

عربی ترجمہ مطبوعہ بیروت میں یہی عبارت یوں ہے۔

أَما تَعلَمونَ أَنَّكُم هَيْكَلُ اللّٰه، وَأَنَّ رُوحَ اللّٰهِ حالٌّ فيكم؟

ایک دوسرے مقام پر پولس اپنے حق میں بھی یہی دعویٰ کرتا ہے۔

''میں سمجھتا ہوں کہ خدا کا روح مجھ میں بھی ہے۔'' (1۔کرنتھیوں 40:7)

عربی ترجمہ مطبوعہ بیروت میں یوں ہے کہ

وَأَظُنُّ رُوحَ اللّٰهِ فِيَّ أَيْضًا

اب اگر ہم پادری حضرات کی منطق کو اپنائیں تو اس کی رو سے تمام حواری اور خود پولس بھی روح اللہ ٹھہرتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام کے روح اللہ ہونے کی خصوصیت ختم ہو جاتی ہے۔

چنانچہ حق بات یہی ہے کہ جب کسی شخص کی شخصیت میں دنیاداری کی بجائے دین داری زیادہ پائی جائے اور جب اس کا دھیان دنیا سے زیادہ دنیا والے کی طرف ہو تو اس کی اس کیفیت کو روح اللہ سے تعبیر کر دیا جاتا ہے یعنی وہ روح جس کا دھیان ہر وقت اللہ ہی کی طرف ہو۔ چنانچہ ایک دوسرے مقام پر اسی معنی کو پولس رسول ان لفظوں میں بیان کرتا ہے۔

"لیکن تم جسمانی نہیں بلکہ روحانی ہو بشرطیکہ خدا کا روح تم میں بسا ہوا ہے۔"

(رومیوں 9:8)

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے متعلق اللہ یا نبیوں کے کلام میں "روح اللہ" کہا گیا ہو تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اس میں اللہ داخل ہو گیا یا وہ خود اللہ ہو گیا۔ قرآن مجید اور بالخصوص بائبل مقدس کے حوالے سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ یہ ایک Title ہے اور اس شخص کی دیگر اشخاص سے فضیلت وعظمت ظاہر کرنے کے لیے دیا جاتا ہے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے چلا آ رہا ہے یہودی قبیلہ کے ایک ممتاز کاریگر کو اللہ نے روح اللہ کہا۔ فرعون نے یوسف علیہ السلام کو روح اللہ کہا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تمام انبیا کرام علیہم السلام کو روح اللہ بنا دیا۔ دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ بائبل مقدس میں ذکر تاریخ انسانی میں کسی بھی نبی نے اس لقب سے مراد وہ نہیں لیا جو پادری حضرات لیتے ہیں۔ نیز کسی امت نے بھی "روح اللہ" کا یہ معنی ومفہوم اختیار نہیں کیا۔ تمام انبیاء کرام کی امتوں میں صرف امت عیسوی کو ہی اس "عقلمندی" کا شرف حاصل ہوا ہے۔

چنانچہ ردالوہیت مسیح کے موضوع پر امام غزالی اپنی مشہور ومعروف کتاب کے آغاز میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

فإني رأيت مباحث النصارى المتعلقة بعقائدهم، ضعيفة المباني، واهية القوى، وعزة المسالك، يقضى المتأمل، من عقول جنحت إليها. غاية عجبه، ولايقف– من تعقيدها– على اليسير من أربه. لا يعولون فيا إلا على التقليد المحض، عاضين على ظواهر أطلقها الأولون، ولم ينهض بايضاح مشكلها، لقصورهم، الآخرون، ظائنين بأن ذلک هو الشرع الذى شرعة لهم، عيسى، عليه السلام، معتذرين عن اعتقادها، بما ورد من نصوص، يعتقدون أنها قاهرة للكفر، غير قافلة للتأويل، وأن صرفها عن ظواهرها (عسير) (الرد الجمیل لالٰہیۃ عیسیٰ، صفحہ 1)

"میں نے مسیحی عقائد کے متعلق چند مباحث دیکھے ہیں، جن کی بنیادیں نہایت کمزور اور قوت

وطاقت سے خالی ہیں اور ان کو اختیار کرنا محض عیب ہے۔ اگر کوئی شخص ان عقائد میں غور کرے تو اسے پتہ چل جائے کہ ان کی عقلیں کتنا عجیب سوچتی ہیں اور نہ وہ ان عقائد کی مشکل گتھیوں کو عقلمندی کے باوجود نہیں سلجھا سکے۔ عیسائیوں نے ان عقائد کو صرف تقلید کی بنا پر اپنا رکھا ہے۔ انہوں نے ان کے ظواہر کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور آنے والی نسلوں نے اپنی کم علمی کی وجہ سے ان مشکلات کی وضاحت نہیں کی۔ اب یہ لوگ گمان کرتے ہیں کہ یہ وہی شریعت ہے جسے عیسیٰ نے مشروع کیا تھا۔ جو کچھ نصوص میں آیا ہے۔ یہ لوگ ان پر اندھا اعتقاد رکھنے کا یہ عذر پیش کرتے ہیں کہ یہ چیزیں انسانی فکر سے ماوراء ہیں۔ ان میں تاویل نہیں ہو سکتی اور ان کے ظاہر کو کوئی معنی نہیں پہنایا جا سکتا۔"

رُوْحٌ مِّنْهُ میں مِن سے کیا مراد ہے؟

مِن حرف جار Preposition ہے اور بہت سے معنی کے لیے آتا ہے مگر سب سے مشہور معنی ابتدائے غایت کے ہی ہیں۔ تمام مفسرین قرآن کے مطابق رُوْحٌ مِّنْهُ میں مِن ابتدائے غایت ہی کے معنی میں آیا ہے، ابتدائے تبعیض کے معنی میں نہیں جیسا کہ پادری حضرات دعویٰ کرتے ہیں کہ مِن سے مراد ذات خداوندی کا حصہ مراد لیتے ہیں اور پھر یہ تفسیر کرتے ہیں کہ ذات خداوندی مسیح علیہ السلام میں حلول کر گئی۔ چنانچہ شیخ اسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ مسیحیوں کے اس تصور کا رد فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ کے قول رُوْحٌ مِّنْهُ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کا کچھ حصہ عیسیٰ علیہ السلام بن گیا بلکہ "مِن" ابتدائے غایت کے لیے ہیں۔ جیسا فرمایا "و سخرلكم ما فی السموات والارض جميعاً منه اور وما بكم من نعمته فمن الله۔" (سورہ اخلاص کی تفسیر، صفحہ 82,81)

آیئے رُوْحٌ مِّنْهُ میں مِن کے استعمال کو ایک قرآنی مثال سے سمجھیں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام ملکہ سبا کو خط میں لکھتے ہیں۔

"اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ" یہ سلیمان کی طرف سے ہے۔ (النمل:30)

یہاں بھی من سے مراد فقط اتنی ہے کہ اس خط کی تخلیق حضرت سلیمان علیہ السلام کی مرضی سے وجود میں آئی تھی یہ ہرگز مطلب نہیں کہ ذات سلیمان علیہ السلام کا کچھ حصہ اس خط کے اندر حلول کر گیا۔ اسی طرح روح منہ سے مراد صرف اتنی ہے کہ اس روح کی تخلیق اللہ کی مرضی سے بغیر اصل اور مادہ کے ہوئی اور بس۔

ہمارے نزدیک پادری حضرات کا رُوْحٌ مِّنْهُ سے مسیح کی الوہیت پر استدلال کئی وجوہ سے باطل ہے اور تحریف معنوی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اسی ایک آیت میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کے رد میں کئی الفاظ موجود ہیں مثلاً لا تغلوفی دینکم، ولا تقولو ثلثه اور مجموعی طور پر ساری آیت تثلیث فی التوحید، الوہیت مسیح کے رد اور رسالت وعبدیت مسیح علیہ السلام کے حق میں ہے پھر درمیان میں سے محض من کی بنیاد پر الوہیت مسیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا تو محض نفسیاتی بیماری کی علامت ہے۔

اگر ان تمام دلائل کے باوجود پادری حضرات یہ اصرار کریں (جیسا کہ مجھے بارہا مرتبہ یہ تجربہ ہوا ہے) کہ ہم تو من سے مراد ابتدائے تبعیض ہی مراد لیں گے تو پھر من کے یہ معنی مخصوص کر دینے کی وجہ سے ان کو نبی کریم ﷺ کو بھی حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح خدا تسلیم کرنا پڑے گا جیسا کہ اس آیت قرآن میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ" (ھود:2)

اب اگر وہاں روح کے ساتھ مِّنْهُ آنے سے مسیح خدا ہو جاتے ہیں تو یہاں حضور ﷺ کے لیے مِّنْهُ کے آنے سے وہ خدا کیوں نہیں ٹھہرتے؟

اب ذرا قرآن مجید کی اس آیت کو بھی غور سے پڑھیے۔

وَسَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ (جاثیہ:13)

لیجیے اب تو ساری مخلوقات کے لیے "مِّنْهُ" کا لفظ آیا ہے اب اگر وہاں روح کے ساتھ مِّنْهُ لگنے کا مطلب یہ ہے کہ روح خود اللہ ہے تو اس آیت میں جمیعاً کے ساتھ منہ لگنے سے ساری مخلوق اللہ کیوں نہ ٹھہری؟ سب شریک الوہیت کیوں نہ ہوئے؟ حتیٰ کہ بائبل مقدس کے عربی ترجمہ مطبوعہ بیروت میں یہ لفظ ساری مخلوق خدا کے حق میں آیا ہے۔

"......وهذا كُلُه مِنَ اللّٰهِ."

"......اور سب چیزیں خدا کی طرف سے ہیں۔" (2۔کرنتھیوں 18:5)

اب تو کائنات کی ہر مخلوق جاندار و بے جان کو مرتبہ الوہیت پر فائز ماننا پڑے گا۔ توحید تو اب مکمل طور پر فوت ہو گئی، اس لیے کہ اب ساری چیزیں "مِن" ہیں۔

اسی طرح یوحنا حواری کا فتویٰ ملاحظہ فرمائیں۔

نیکی کرنے والا خدا سے ہے۔ (3۔یوحنا 11:1)

عربی ترجمہ مطبوعہ بیروت کی عبارت یوں ہے۔

"مَنْ یَعْمَلُ الخَیرَ فهو مِنَ اللّٰه."

یوحنا کے مطابق تو اب ہر نیک اور متقی شخص خود خدا ہو گیا اس لیے کہ وہ "مِن" ہے۔

یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہماری یہ ساری گفتگو الزامی ہے۔ ہم ہرگز ایسا نہیں سوچتے۔ ہمارے نزدیک درست اور حق بات یہی ہے کہ رُوْحٌ مِّنْهُ میں مِن سے مراد ابتدائے غایت ہے اور یہ محض سمت Direction ظاہر کر رہا ہے کہ اس روح کی تخلیق اللہ کی مرضی سے وجود میں آئی۔ آخر جس کی تخلیق تھی اسی ہی کی طرف تو اشارہ کرنا تھا اور کون تھا مسیح علیہ السلام کی روح کا خالق؟ چنانچہ حق عقیدہ وہی ہے جس کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان الفاظ میں بیان فرمادیا:

"سو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ "احد" اور "صمد" ہے اس کی تقسیم و تجزی ناممکن ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کا کچھ حصہ اس کے غیر میں تبدیل ہو جائے خواہ اس حصے کا نام روح ہو یا کچھ اور۔ اس کا حکم ایک ہی ہے اس لیے نصاریٰ کا یہ وہم باطل ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کا بیٹا ہے اور یہ امر واضح ہو گیا کہ وہ اللہ کے بندوں میں سے ایک بندہ ہے۔"

(سورہ اخلاص تفسیر، صفحہ 83)

رُوْحٌ مِّنْهُ میں اللہ کی طرف نسبت کیوں؟

رُوْحٌ مِّنْهُ میں اضافت تشریف ہے۔ یعنی بعض اوقات باری تعالیٰ کسی چیز کی عظمت ظاہر کرنے کے لیے اسے اپنی طرف منسوب فرما دیتے ہیں۔ اس نسبت کو اضافت تشریف کہتے ہیں۔ اس نوعیت کی بے شمار مثالیں قرآن مجید اور بائبل مقدس اور انسانی کلام میں موجود ہیں۔ مثلاً سورۃ

بقرہ میں فرمایا۔

"طھر بیتی" میرے گھر کو پاک کرو۔ (بقرہ:125)

اب کعبۃ اللہ کو میرا گھر کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خدا اس گھر میں رہتا ہے بلکہ اس طرز خطاب میں حکمت یہ ہے کہ دیگر تمام مقامات عبادت سے اس گھر کی عظمت سب پر عیاں ہو جائے۔ اسی طرح ایک دوسرے مقام پر نبی کریم ﷺ کے حق میں فرمایا۔

"اسری بعبدہ" (بنی اسرائیل:1)

بندے برے ہوں یا اچھے تخلیق کے اعتبار سے تو سب اسی ذات کے ہی بندے ہیں مگر اس منفرد بندے ﷺ کی بندگی کی نسبت اپنی طرف خصوصی طور پر فرما کر دیگر بندوں سے اس کی عظمت و رفعت نمایاں کر دی۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ شیطان کو فرماتے ہیں۔

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان (سورۃ)

یعنی میرے بندوں پر تو قابو نہیں پا سکتا۔ یہاں بھی وہی بات کہ بندے تو سب اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں لیکن اطاعت شعار بندوں کی اضافت اپنی طرف کی اور ان کو اپنا مخصوص اور مخلص بندہ ہونے کا شرف وعزت بخشی۔

رُوحٌ مِّنْهُ میں بھی اضافت تشریف ہے۔ چنانچہ رُوحٌ مِّنْهُ کی تفسیر کے تحت امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں۔

"اضافة لذک الروح الی نفسه لاجل التشریف والتعظیم"

اللہ تعالیٰ کی طرف روح کی یہ اضافت تشریف وتعظیم کے طور پر ہے۔

(تفسیر کبیر ج11 ص116)

امام قرطبی فرماتے ہیں۔

"وھذا لا ضافة للتفضیل وان کان جمیع الارواح من خلقه وھذا کھوله طھر بیتی۔"

اس میں اضافت تشریف ہے اور تمام ارواح اللہ ہی کی تخلیق کردہ ہیں اور یہ قول طھر بیتی کی طرح ہے۔ (القرطبی ج6 ص23)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

واضیفت الروح الی اللہ علی وجه التشریف کا اضیفت الناقة والبیت الی اللہ فی قوله (ھذہ ناقة اللہ) و فی قوله (وطھر بیتی للطائفین)

"آپ کو روح اللہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے ناقۃ اللہ اور بیت اللہ کہا یعنی شرافت کے اظہار کے طور پر اپنی طرف نسبت کی۔" (تفسیر ابن کثیر ج1، صفحہ 590)

صاحب تفسیر جلالین لکھتے ہیں۔

أضيف إليه تعالى تشريفاً له وليس كما زعمتم ابن الله أوإلها معه أوثالث ثلاثة لأن ذا الروح مركب والاله منزه عن التركيب وعن نسبة المركب أليه

"روح کی اضافت حق تعالیٰ کی طرف تشریفاً کی گئی ہے۔ یہ نہیں جیسا کہ تم نصاریٰ خیال کرتے ہو کہ وہ اللہ کے بیٹے ہیں یا اللہ کے ساتھ شریک الوھیت ہیں یا تین خداؤں (تثلیث) میں سے ایک ہیں کیونکہ ہر جاندار چیز مرکب ہوتی ہے اور اللہ کی شان اس سے بالاتر ہے کہ مرکب وترکیب کی نسبت اس کی طرف کی جائے۔"

(تفسیر جلالین ج1 ص104)

شیخ اسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"جب کسی معنی کی اضافت اور نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور وہ معنی خود قائم بالذات نہ ہو اور نہ کسی دوسری ذات کے ساتھ وابستہ ہو تو وہ لامحالہ اللہ تعالیٰ کی صفت قرار پائے گا۔ اس صورت میں اس کی اضافت مخلوق ومربوب جیسی نہ ہوگی۔ جیسے علم، قدرت اور کلمہ وغیرہ۔

اگر کسی ایسی چیز کی اضافت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو جو بذات خود قائم ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کی صفت نہ ہوگی کیونکہ جو چیز بذات خود قائم ہو وہ دوسرے کی صفت نہیں بن سکتی جیسے عیسیٰ علیہ السلام، جبرئیل علیہ السلام اور تمام ارواح وغیرہ۔

وہ اشیاء جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی ہیں، دو قسم پر ہیں:

پہلی قسم یہ ہے کہ وہ اشیاء اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں کہ وہ

اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں تو یہ قسم تمام مخلوقات کو شامل ہے، جیسے سماء اللہ، ارض اللہ۔ پس اس صورت میں تمام مخلوق اللہ کریم کی مملوک ہوگی اور تمام مال اللہ تعالیٰ کا مال کہلائے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ وہ اشیاء اس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے خصوصیت عطا کی ہے، ان سے پیار و محبت کرتا ہے، ان پر عمل پیرا ہونے کا حکم دیتا ہے اور ان سے خوش ہے جیسے بیت اللہ، کہ یہ مقام اللہ کی عبادت کے لیے خاص ہے اور یہ اضافت اسی خصوصیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یا مال خمس اور مال فیٔ کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ''یہ میرا اور میرے رسول کا مال ہے۔'' اس اضافت کے معنی یہ ہیں کہ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کی جائے۔

عباد اللہ میں اضافت کا مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کو مانتے اور ان کی پیروی کرتے ہیں۔ گویا یہ اضافت اللہ کی الوہیت پر دال ہے اور اس کے دین اور شریعت کی اطاعت کو متضمن ہے۔

(دیکھئے تفسیر سورۃ اخلاص ص 82 اور ہدایۃ المستفیذ ص 216,214)

اضافتِ تشریف کی بے شمار مثالیں بائبل مقدس میں بھی موجود ہیں۔ مثلاً

''اور تم جو اس وقت یہ کلام سنتے ہو رب الافواج کے گھر یعنی ہیکل کی تعمیر کے لیے بنیاد ڈالتے وقت نبیوں کی معرفت نازل ہوا۔'' (زکریا 9:8)

کتاب پیدائش میں حضرت یعقوب علیہ السلام خدا سے منت مانگتے ہوئے فرماتے ہیں۔

''اور یہ پتھر جو میں نے ستون سا کھڑا کیا ہے خدا کا گھر ہوگا۔'' (پیدائش 23:28)

ان آیات میں ''خدا کا گھر''، ''رب الافواج کا گھر'' میں اضافت تشریف ہے یعنی ایسے طرز خطاب کا مقصد محض ان مقامات کی دیگر مقامات سے فضیلت واضح کرنا ہے وگرنہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا ان گھروں میں مقیم رہتا ہے جیسا کہ ایک دوسرے مقام پر بائبل مقدس میں لکھا ہے۔

''خداوند یوں فرماتا ہے کہ آسمان میرا تخت اور زمین میرے پاؤں کی چوکی تم میرے لیے کیسا گھر بناؤ گے اور کونسی جگہ میری آرام گاہ ہوگی کیونکہ یہ سب چیزیں تو

میرے ہاتھ نے بنائیں۔'' (یسعیاہ 1:66)

چند اور حوالے ملاحظہ فرمائیں۔

''سو انہوں نے خداوند کے صندوق کو کونسی گاڑی پر رکھا......'' (2۔سموئیل 3:6)

''چنانچہ آج تک یہ کہاوت موجود ہے کہ خداوند کے پہاڑ پر مہیا کیا جائے گا۔'' (پیدائش 14:22)

''اور خداوند کے بندہ موسیٰ کی وفات کے بعد ایسا ہوا۔'' (یسوع 1:1)

ان تمام آیات میں خدا کا صندوق، خدا کا پہاڑ، اور خداوند کے بندہ میں اضافت تشریف ہے۔

الغرض ''رُوْحٌ مِّنْهُ'' میں اضافت تشریف ہے اور اس اضافت سے کسی بھی طرح مسیح علیہ السلام کی الوہیت ثابت نہیں ہوتی۔ یہی وہ نازک مقام تھا جہاں مسیحی علماء و پادریوں نے ٹھوکر کھائی اور اس نسبت کو حلول و تجسم Incarnation کے وہ معنی اپنائے جو قرآن و سنت اور عقل انسانی کے صریح خلاف تھے۔ شاید پادری صاحبان کے نزدیک بائبل اور قرآن میں مخلوق کی خالق کی طرف نسبت جہاں بھی آئی ہے اپنے حقیقی معنی میں ہے مجاز میں نہیں۔ حالانکہ اس کے برعکس بائبل مقدس کے بے شمار مقامات پر خالق کی طرف مخلوق کی نسبت حقیقی معنی میں نہیں بلکہ مجازی معنی میں آئی ہے مثلاً

۱۔ ''تم خدا کی کھیتی اور خدا کی عمارت ہو۔'' (1۔کرنتھیوں 9:3)

۲۔ ''اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔'' (افسیوں 6:4)

لیجئے کتاب افسیوں کی اس عبارت کے مطابق تو سب خدا ٹھہرے۔ کیونکہ خدا ''سب کے اندر ہے'' اب اگر یہاں مجازی معنی اختیار نہ کیے جائیں تو سب کا اللہ ہونا لازم آتا ہے۔

۳۔ ''......مسیح سب کے اندر ہے۔'' (کلسیوں 11:3)

مسیح چونکہ مسیحی عقائد کے مطابق خدا ہیں اور چونکہ وہ سب کے اندر بھی ہیں لہٰذا سب کا خدا ہونا لازم ہوا۔ لہٰذا توحید کو بچانے کے لیے یہاں بھی مجازی معنی اختیار کرنا بہت ضروری ہیں۔ چند آیات اور ملاحظہ فرمائیں۔

''......جو کوئی راستبازی کے کام کرتا ہے وہ اس (خدا) سے پیدا ہوا ہے۔''

(1۔یوحنا29:2)

''......جو کوئی محبت رکھتا ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے۔'' (1۔یوحنا7:4)

لہٰذا حق بات وہی ہے جو ہم نے پہلے بتائی کہ رُوْحٌ مِّنْهُ میں بائبل مقدس کی ان آیات کی طرح اضافت تشریف ہے۔ اب ہم قرآن مجید اور بائبل مقدس کی روشنی میں حضرت مسیح علیہ السلام پر لفظ ''روح'' کے اطلاق کی وجہ بیان کریں گے۔

حضرت عیسیٰ کو روح اللہ کیوں کہا گیا؟

ا۔ قرآن مجید اور بائبل مقدس میں روح بمعنی رحمت کے بھی آیا ہے مثلاً سورۃ یوسف آیت 82 میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

يٰبَنِيَّ اذْهَبُوْا فَتَحَسَّسُوْا مِنْ يُّوْسُفَ وَ اَخِيْهِ وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ
رَّوْحِ اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ

''اے میرے بیٹو! جاؤ اور سراغ لگاؤ یوسف کا اور اس کے بھائی کا اور مایوس نہ ہو جاؤ رحمت الٰہی سے، بلاشبہ مایوس نہیں ہوتے رحمت الٰہی سے مگر کافر لوگ۔''

(یوسف:87)

بائبل مقدس میں بھی روح بمعنی رحمت کئی مقامات پر آیا ہے۔ مثلاً

''میں اپنی روح تیری نسل پر اور اپنی برکت تیری اولاد پر نازل کروں گا۔''

(یسعیاہ3:44)

''خداوند کی روح مجھ پر ہے کیونکہ اس نے مجھے مسح کیا تاکہ حلیموں کو خوشخبری سناؤں۔'' (یسعیاہ1:61)

''اور اس کے بعد میں ہر فرد بشر پر اپنی روح نازل کروں گا اور تمہارے بیٹے اور بیٹیاں نبوت کریں گے، تمہارے بوڑھے خواب اور جوان رویا دیکھیں گے۔''

(یوایل28:2)

اسی معنی کے اعتبار سے رُوْحٌ مِّنْهُ یا روح اللہ بمعنی رحمت اللہ ہوگا یعنی آپ رحمت اللہ تھے چونکہ

آپ اللہ کی طرف سے بنی اسرائیل پر خدا کی رحمت بن کر آئے تھے اس لیے آپ کو روح اللہ کہا جاتا ہے۔

۲۔ بائبل مقدس میں روح اللہ بمعنی قدرت اللہ کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔

انجیل متی حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشاد کو اس طرح نقل کرتی ہے۔

''لیکن اگر میں خدا کی روح کی مدد سے بدروحوں کو نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آ پہنچی۔'' (انجیل متی28:12)

لوقا نے اسی قول کو یوں نقل کیا ہے۔

''لیکن اگر میں بدروحوں کو خدا کی قدرت سے نکالتا ہوں تو خدا کی بادشاہی تمہارے پاس آ پہنچی۔'' (انجیل لوقا20:11)

دیکھئے! متی نے ''خدا کی روح'' کے الفاظ لکھے اور لوقا نے ان کی تفسیر ''خدا کی قدرت'' کے ساتھ کر دی۔ یعنی یہاں روح اللہ سے مراد قدرت اللہ ہے اسی معنی کے اعتبار سے مسیح کو روح اس لیے کہا گیا کیونکہ وہ اللہ کی قدرت سے معجزۃً پیدا ہوئے۔

۳۔ بائبل مقدس میں ہر اس شخص پر ''روح'' کا اطلاق کیا گیا ہے جس کو روحانی طور پر اللہ کے بہت قریب سمجھا جاتا ہو۔ جس کا جینا مرنا سب اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کو فرعون نے روح اللہ کہا، دانی ایل نبی کو کہا گیا کہ تم میں مقدس الٰہوں کی روح ہے۔ اسی طرح پولس رسول اپنے اور حواریوں کے حق میں بھی کہتا ہے کہ ہم سب میں اللہ کی روح ہے۔ اس کے حوالے آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ اس اطلاق کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ کو روح اس لئے کہا گیا کیونکہ آپ کی حیات میں کوئی بھی آپ سے بڑھ کر اللہ کے قریب نہیں تھا۔ نبی سے بڑھ کر اور کون اللہ کے قریب ہوسکتا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام چونکہ ہر اعتبار سے سب سے بڑھ کر روحانیت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے اس لیے آپ پر ''روح'' کا اطلاق کر دیا گیا۔

۴۔ روح کا معنی ہے مابہ الحیاۃ جس کے ساتھ زندگی قائم ہو، اور زندگی دو قسم کی ہوتی ہے۔ حسی اور معنوی۔ حسی زندگی وہ ہے جس کے ذریعے چلنا پھرنا، بولنا، سننا اور سمجھنا اور یاد کرنا وغیرہ قسم کے افعال سرزد ہوتے ہیں اور معنوی وہ ہے جس سے مکارم اخلاق رحم سخاوت، محبت وغیرہ کا ظہور ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم کو بھی روح کہا گیا ہے کیونکہ وہ حیات معنوی کا سبب ہے جیسا

کہ ارشاد ہے۔

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا (شوریٰ:52)

''اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح یعنی قرآن نازل فرمایا۔''

اور حضرت مسیح کیونکہ حیات حسی اور معنوی دونوں کے مظہر اتم تھے اس لیے آپ کو بطور مبالغہ روح کہہ دیا جیسے ہم کسی بہت خوب صورت انسان کو ''حسن مجسم'' کہہ دیتے ہیں۔

۵۔ جب کسی چیز کی پیدائش خلاف عادت طریقہ یعنی معجزۃً ہو تو تب بھی خصوصاً اس کی نسبت اللہ اپنی طرف فرما دیتا ہے جیسا حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کو سورۃ شمس کی آیت 13 میں ''ناقۃ اللہ'' یعنی اللہ کی اونٹنی فرما دیا۔ یعنی وہ اونٹنی جو اللہ نے خلاف عادت طریقہ پر معجزہ پیدا فرمائی۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ کو روح اللہ اس لیے کہا گیا کیونکہ آپ بغیر اصل اور مادہ کے خلاف عادت طریقہ پر پیدا ہوئے۔

۶۔ بائبل مقدس میں روح بمعنی ''واعظ حق'' کے بھی آیا ہے۔ چنانچہ یوحنا اپنے پہلے خط کے باب 4 میں لکھتا ہے۔

''اے عزیزو! ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روحوں کو آزماؤ کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں یا نہیں کیونکہ بہت سے جھوٹے نبی دنیا میں اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، خدا کے روح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ اور جو کوئی روح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خدا کی طرف سے نہیں اور یہی مخالف مسیح کی روح ہے۔ جس کی خبر تم سن چکے ہو کہ وہ آنے والی ہے بلکہ اب بھی دنیا میں موجود ہے۔ اے بچو! تم خدا سے ہو اور ان پر غالب آگئے ہو کیونکہ جو تم میں ہے وہ اس سے بڑا ہے جو دنیا میں ہے، وہ دنیا سے ہیں۔ اس واسطے دنیا کی سی کہتے ہیں اور دنیا ان کی سنتی ہے۔ ہم خدا سے ہیں۔ جو خدا کو جانتا ہے وہ ہماری سنتا ہے۔ جو خدا سے نہیں وہ ہماری نہیں سنتا۔ اسی سے ہم حق کی روح اور گمراہی کو پہچان لیتے ہیں۔ (1۔یوحنا 4:1تا6)

یوحنا کی اس عبارت میں اس نے دین مسیح کی تبلیغ کرنے والے عام لوگوں پر ''روح'' اور ''خدا کی روح'' کا اطلاق کر دیا ہے۔ اس عبارت کی رو سے اگر عام پادری حضرات روح اللہ کہلا

سکتے ہیں تو وہ شخص جو سراپا رحمت اور ہدایت تھا روح اللہ کیوں نہیں کہلایا جا سکتا۔ اگر پادری حضرات روح اللہ ہونے سے اللہ نہیں بنتے تو حضرت مسیح علیہ السلام کو روح اللہ کہنے سے وہ اللہ کیسے بن سکتے ہیں؟ اگر حق کی تبلیغ کرنے سے یہ روح اللہ بن سکتے ہیں تو حضرت مسیح سے بڑھ کر حق کی تبلیغ کرنے والا کون تھا؟ اس معنی کے اعتبار سے آپ روح اللہ کیوں نہ ہوئے؟

7۔ بضلی ایل کے متعلق ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

''پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا۔ دیکھ میں نے بضلی ایل بن اوری بن حور کو یہوواہ کے قبیلہ میں سے نام لے کر بلایا ہے۔ اور میں نے اس کو حکمت اور فہم اور علم اور ہر طرح کی صنعت میں روح اللہ سے معمور کیا ہے۔ تا کہ ہنرمندی کے کاموں کو ایجاد کرے اور سونے اور چاندی اور پیتل کی چیزیں بنائے۔'' (خروج 31:1تا4)

دیکھئے اس آیت میں یہودی قبیلہ کے محض ایک ماہر کاریگر (جو نبی نہیں تھا) کی ماہرانہ صلاحیتوں کو بیان کرنے کے لیے اور دیگر کاریگروں سے اس کی عظمت نمایاں کرنے کے لیے اس پر ''روح اللہ'' کا اطلاق کر دیا گیا۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام جو منصب نبوت پر فائز تھے اور اللہ نے آپ کو اس حد تک قابل بنایا کہ جس مردے کو چاہتے اللہ کے حکم سے زندہ کر دیتے۔ اس دور کے حکیم اور اطبا کے لیے اس سے بڑھ کر حیران کن صلاحیت اور کیا ہو گی؟ اگر یہودی کاریگر محض اپنے کام میں ماہر ہونے کی وجہ سے روح اللہ کہلا سکتا ہے تو حضرت مسیح علیہ السلام نبی ہوتے ہوئے مردے زندہ کر کے بھی روح اللہ کیوں نہیں کہلا سکتے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے دور کے تمام لوگوں سے حکمت، فہم، علم اور ہر طرح کی صلاحیت میں سب سے بڑھ کر تھے اس لیے آپ کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

۸۔ قرآن مجید میں روح بمعنی نصرت، حمایت اور مدد کے معنی میں بھی آیا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (المجادلہ:22)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی اس معنی کے حوالے سے اس لیے روح اللہ کہا گیا کیونکہ آپ بھی اپنے دور کے مظلوم اور حالات کی چکی میں پسنے والے لوگوں کی طرف اللہ کی نصرت و مدد اور حمایت بن کر آئے تھے چنانچہ اس کے متعدد حوالے ہمیں آپ کی سیرت کے مطالعہ میں ملتے ہیں مثلاً

"اور یسوع تمام گلیل میں پھرتا رہا اور ان کے عبادتخانوں میں تعلیم دیتا اور بادشاہی کی خوشخبری کی منادی کرتا اور لوگوں کی ہر طرح کی بیماری اور ہر طرح کی کمزوری کو دور کرتا رہا۔ اور اس کی شہرت تمام سوریہ میں پھیل گئی اور لوگ سب بیماروں کو جو طرح طرح کی بیماریوں اور تکلیفوں میں گرفتار تھے اور ان کو جن میں بدروحیں تھیں اور مرگی والوں اور مفلوجوں کو اس کے پاس لائے اور اس نے ان کو اچھا کیا۔"

(انجیل متی:4:33,34)

لوگوں کی جسمانی اور روحانی بیماریوں کو ٹھیک کرنا وَاَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ کی عملی تفسیر ہی تو ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو روح اللہ اس لیے کہا گیا کہ وہ بنی اسرائیل کے مظلوم اور جسمانی و روحانی بیماریوں میں مبتلا لوگوں کی اللہ سے دعا کا جواب تھے۔ اللہ نے اپنے نبی کی صورت میں ان کی طرف اپنی روح (مدد) بھیجی۔

کلمۃ اللہ سے مسیحی استدلال کیا ہے؟

ہم مسلمانوں کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہنے سے پادری حضرات کے چہروں پر رونق کیوں آجاتی ہے۔ آیئے! پہلے اس کی وجہ کو سمجھیں۔

موجودہ مسیحیت توحید کی بجائے تثلیث فی التوحید پر ایمان رکھتی ہے یعنی خدا ایک تو ہے مگر اس کی وحدت تین اقانیم سے عبارت ہے: باپ، بیٹا اور روح القدس۔ باپ سے مراد خدا کی ذات ہے جس میں اس کی صفت کلام اور صفت حیات سے قطع نظر کر لی گئی ہے۔ "بیٹے" سے مراد عیسائیوں کے نزدیک خدا کی صفت کلام Word of God ہے۔ لیکن یہ انسانوں کی صفت کلام کی طرح نہیں ہے، انسانوں کی صفت کلام اور خدا کی صفت کلام کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے ایکویناس Aquinas مشہور و معروف مسیحی عالم اور فلسفی لکھتا ہے۔

"انسانی فطرت میں صفت کلام کوئی جوہری وجود نہیں رکھتی، اسی وجہ سے اس کو انسان کا بیٹا یا موجود نہیں کہہ سکتے، لیکن خدا کی صفت کلام ایک جوہر ہے جو خدا کی ماہیت میں اپنا ایک وجود رکھتا ہے، اسی لیے اس کو حقیقتاً، نہ کہ مجازاً بیٹا کہا جاتا ہے اور اس کی اصل کا نام باپ ہے۔" (The Summa Theologica, Aquinas)

عیسائی عقیدے کے مطابق اس صفت کے ذریعے تمام اشیاء پیدا ہوئی ہیں۔ یہ صفت باپ کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ خدا کی یہی صفت یسوع مسیح بن مریم کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی۔ جب تک حضرت مسیح علیہ السلام دنیا میں رہے یہ خدائی اقنوم ان کے جسم میں حلول کیے رہا، یہاں تک کہ یہودیوں نے آپ کو پھانسی پر چڑھا دیا، اس وقت یہ خدائی اقنوم ان کے جسم سے الگ ہو گیا، پھر تین دن کے بعد آپ دوبارہ زندہ ہو کر حواریوں کو دکھائی دیئے، اور انہیں کچھ ہدایتیں دے کر آسمان پر تشریف لے گئے، اور یہودیوں نے آپ کو جو پھانسی پر چڑھایا تو اس سے تمام عیسائی مذہب پر ایمان رکھنے والوں کا وہ گناہ معاف ہو گیا جو حضرت آدم علیہ السلام کی غلطی سے ان کی سرشت میں داخل ہو گیا تھا۔ اس عقیدے کو عقیدۂ حلول و تجسم Incarnation کہتے ہیں۔

حلول و تجسم کا عقیدہ سب سے پہلے ہمیں انجیل یوحنا میں ملتا ہے، اس انجیل کا مصنف حضرت مسیح علیہ السلام کی سوانح کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے۔

"ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا یہی ابتداء میں خدا کے ساتھ تھا۔" (انجیل یوحنا 2,1:1)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے۔

"اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔" (انجیل یوحنا 14:1)

مسیحیت میں "کلام" خدا کے اقنوم ابن سے عبارت ہے، جو خود مستقل خدا ہے، اس لیے یوحنا علیہ السلام کی عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفت کلام یعنی بیٹے کا اقنوم مجسم ہو کر حضرت مسیح کے روپ میں آ گیا۔

جب قرآن آپ کو کلمۃ کہتا ہے تو پادری حضرات فوراً اس سے یہ مراد لیتے ہیں کہ قرآن نے مسیح کو کلمۃ اللہ کہہ کر ہمارے اس عقیدہ حلول و مجسم کی تصدیق کر دی۔ یعنی کلمۃ اللہ کا مطلب یہ ہے کہ مسیح میں تثلیث کا دوسرا اقنوم کلمہ حلول کر گیا۔ یہ ہے قرآنی لفظ کلمۃ کی مسیحی تفسیر اور اب ہم تفصیل سے اس بات کا جائزہ لیں گے کہ قرآن مجید کے لفظ کلمہ سے کیا مراد ہے اور درست تفسیر کیا ہے؟

صرف توحید یا تثلیث فی التوحید

اس ضمن میں سب سے پہلی بات یہ ذہن میں رکھئے کہ قرآن نے وَلَا تَقُولُوْا ثَلٰثَۃٌ کہہ کر مسیحی تصور تثلیث فی التوحید کا رد کر دیا ہے۔ کلمۃ اللہ کی مسیحی تفسیر کی بنیاد تو تثلیث فی التوحید کے عقیدہ پر تھی تو جب قرآن نے اس تصور کا رد کر دیا تو کلمہ بحیثیت اقنوم اور اس کے مسیح علیہ السلام کی ذات میں حلول کر جانے کا خود بخود رد ہو گیا۔

کلمہ بحیثیت اقنوم تعلیمات انبیاء کی روشنی میں

دوسرا دلچسپ نکتہ یہ ہے کہ آپ پورے عہد نامہ قدیم کا مطالعہ کر لیں آپ کو کسی نبی کی یہ تعلیم نہیں ملے گی کہ درست تصور توحید کی بجائے تثلیث فی التوحید کا ہے اور اس توحید کے تین اقانیم ہیں اور نہ ہی کسی نبی کی شریعت میں کلمہ بمعنی اقنوم آیا ہے۔ سب انبیاء نے تثلیث فی التوحید کی

بجائے صرف اور صرف توحید ہی کی تعلیم دی جو بذات خود "تثلیثی وحدت" کے رد پر ایک دلیل ہے چنانچہ بائبل مقدس کے ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

"اور میں نے اپنے تمام خدمت گزار نبیوں کو تمہارے پاس بھیجا اور ان کو بروقت یہ کہتے ہوئے بھیجا کہ تم ہر ایک اپنی بری راہ سے باز آؤ اور اپنے اعمال کو درست کرو اور غیر معبودوں کی پیروی اور عبادت نہ کرو۔" (یرمیاہ 15:35)

کتاب یرمیاہ ہی میں ایک دوسرے مقام پر لکھا ہے۔

"اور خداوند نے اپنے سب خدمت گذار نبیوں کو تمہارے پاس بھیجا پر تم نے نہ سنا اور نہ کان لگایا۔ انہوں نے کہا کہ تم سب اپنی اپنی بری راہ سے اور اپنے برے کاموں سے باز آؤ اور اس ملک میں جو خداوند نے تم کو اور تمہارے باپ دادا کو قدیم سے ہمیشہ کے لئے دیا ہے بسو، اور غیر معبودوں کی پیروی نہ کرو کہ ان کی عبادت و پرستش کرو اور اپنے ہاتھوں کے کاموں سے مجھے غضبناک نہ کرو اور میں تم کو کچھ ضرر نہ پہنچاؤں گا۔" (یرمیاہ 25:4 تا 6)

بائبل مقدس کی ان دو آیات میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا ہے کہ نجات کا دارومدار تثلیثی تصور سے پاک توحید اور اعمال صالحہ پر ہے اس تصور کی تصدیق قرآن مجید کی اس آیت سے بھی ہوتی ہے۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا (الکہف:110)

"پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو۔"

یرمیاہ کی عبارات اس اعتبار سے اہم ہیں کیونکہ ان میں "اپنے سب خدمت گار نبیوں" کے الفاظ کے تحت تمام انبیاء کی تعلیمات کا نچوڑ پیش کر دیا گیا ہے۔ اگر صحیح عقیدہ توحید کی بجائے تثلیث فی التوحید کا ہوتا تو یہاں اس کی تصریح آ جاتی۔ مگر یرمیاہ نبی سمیت کسی بھی نبی نے اس "تثلیثی وحدت" کو بیان نہیں کیا۔

انبیاء کی پیش کردہ اس توحید کی تثلیثی تشریح کا بانی انجیل یوحنا کا مصنف اور پولس رسول ہے

جسے بعد ازاں مسیحی علما کی فلسفیانہ وضاحت نے زندگی بخشی۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے ارشادات میں بھی ہمیں اس تثلیثی فارمولے کی کوئی بنیاد نہیں ملتی اور نہ ہی آپ کے ارشادات میں کلمہ بمعنی اقنوم کی کوئی خبر ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"انبیاء کے کلام میں سے کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں اللہ تعالیٰ کی صفت کو خواہ وہ کلام ہو یا غیر کلام، بیٹے سے موسوم کیا گیا ہو، پس ان لوگوں کا اللہ کی صفت کو بیٹے سے موسوم کرنا کلام انبیاء کی کھلی تحریف کے مترادف ہے۔ انہوں نے مسیح سے جو یہ قول نقل کیا ہے کہ "باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے لوگوں کا قصد کرو" تو اس میں مسیح علیہ السلام کی مراد بیٹے سے" "صفۃ اللہ" یعنی "کلمہ" نہ تھی اور نہ "روح القدس" سے مراد اس کی حیات تھی۔ کیونکہ کلام انبیاء سے اس طرح کے معنی کا کوئی منشا ظاہر نہیں ہوتا۔" (تفسیر سورۃ اخلاص صفحہ 73)

اللہ احد ہونے کے ساتھ صمد بھی ہے

صمد کا ایک معنی یہ بھی ہے کہ جس سے کوئی چیز نہ نکلے، اس معنی میں ہے کہ کوئی چیز اس سے جدا نہیں ہوتی۔ لہٰذا مسیحی حضرات کا یہ کہنا کہ صفت کلام اللہ سے نکل کر مسیح میں حلول کر گئی لغو اور باطل بات ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"حدیث میں آیا ہے "ماتقرب العباد الی اللہ بشی افضل مما خرج منہ" یعنی بندوں کو خدا سے قریب کرنے والی کوئی چیز قرآن سے افضل نہیں جو اس کی زبان سے نکلی ہے۔

جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مسیلمہ کا قرآن سنا تو آپؓ نے کہا "ان ھذا لم یخرج من اللہ۔" (یہ خدا کے منہ سے نہیں نکلا) متکلم کے منہ سے کلام کے نکلنے کے یہ معنی ہیں کہ وہ بات کرتا ہے اور اس سے بات سنی جاتی ہے اور دوسرے آدمی تک پہنچ جاتی ہے، دوسرے میں پیدا نہیں ہوتی جیسا کہ جہمیہ کا قول ہے۔

یہ خروج اس معنی میں نہیں ہوتا کہ جو اشیاء متکلم کے ساتھ قائم ہوتی ہیں ان میں

سے کوئی چیز علیحدہ ہو کر دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ یہ بات تو مخلوقات کی صفات سے بھی بعید ہے کہ صفت اپنے محل کو چھوڑ کر غیر محل میں چلی جائے، چہ جائیکہ خالق کی صفات کے ساتھ یہ کیفیت وارد ہو۔ اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کے کلام کے متعلق فرمایا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّ لَا لِاٰبَآىِٕهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا (الکھف:81)

"ان کے منہ سے یہ بہت بڑے گناہ کا کلمہ نکل رہا ہے وہ بالکل جھوٹ کہہ رہے ہیں۔"

یہ کلمہ متکلم کے ساتھ قائم ہے اور اس سے سنا گیا ہے، اس کا منہ سے نکلنا ایسا نہیں ہے کہ کلام جو اس کی ذات کے ساتھ قائم تھا، اس سے علیحدہ ہو کر دوسرے کی طرف منتقل ہو گیا۔ ہر چیز کا خروج اس کی شان کے مطابق ہوتا ہے۔ علم و کلام کی شان یہ ہے کہ جب عالم اور متکلم سے استفادہ کیا جاتا ہے تو علم و کلام اپنے محل سے گھٹتا نہیں، وہ ایک روشنی ہے جس سے ہر شخص ضیا اندوز ہوتا ہے اور روشنی علی حالہ قائم رہتی ہے۔ ذرا نہیں گھٹتی۔ اس لیے سلف کا یہ قول کہ الصمد وہ ہوتا ہے جس سے کوئی چیز نہ نکلے، اس معنی میں صحیح ہے کہ اس سے کوئی چیز جدا نہیں ہوتی۔

چنانچہ کسی کا اس سے پیدا ہونا، یا اس کا کسی سے پیدا ہونا ممتنع ہے۔

(تفسیر سورہ اخلاص، صفحہ 25,26)

خلاصہ گفتگو یہ ہے کہ قرآن نے ولا تقولو ثلثۃ کے مقابل اللہ الصمد کے تصور کو پیش کیا ہے۔ ثلثہ میں اس کی صفت کلام کے اس سے نکل کر مسیح میں حلول کر جانے کا عقیدہ تھا جس کے جواب میں اس نے اپنا تعارف "الصمد" کی حیثیت سے کروایا یعنی اس کی صفات میں کوئی صفت بھی نکل کر کسی دوسری چیز میں حلول نہیں کرتی۔

لفظ "کلمہ" قرآن و بائبل کی روشنی میں

ان چند نکات کو ذہن میں رکھ کر اب یہ بات سمجھیں کہ لفظ کلمہ لغت عرب اور قرآن مجید کے

کسی بھی مقام پر بمعنی ذات یا اقنوم کے استعمال نہیں ہوا۔ قرآن مجید میں جہاں بھی کلمہ یا اس کی جمع کلمات خدا کی طرف سے مضاف ہو کر آیا ہے۔ جیسے کلمۃ اللہ، کلمہ ربک، کلمات ربہا وغیرہ وہاں بمعنی کلام خدا، وحی خدا یا حکم خدا کے معنی میں آیا ہے مثلاً

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ (عمران 64)

'' (میرے نبی!) آپ کہئے اہل کتاب آؤ اس بات کی طرف جو یکساں ہے۔''

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا (الانعام:115)

''اور مکمل ہوگئی آپ کے رب کی بات''

وَكَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا (توبہ:40)

''اور اللہ کی بات یہ ہمیشہ سربلند ہے''

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ (صافات:171)

''اور ہمارا وعدہ اپنے بندوں کے ساتھ جو رسول ہیں پہلے ہو چکا''

خود بائبل مقدس میں کلمہ بمعنی کلام خدا اور حکم خدا آیا ہے مثلاً

'' آسمان خداوند کے کلام سے اور اس کا سارا لشکر اس کے منہ کے دم سے بنا۔''

(زبور 6:33)

''ہاں گھاس مرجھاتی ہے، پھول کملاتا ہے پر ہمارے خدا کا کلام ابد تک قائم ہے۔''

(یسعیاہ 8:40)

''اور اسی رات ایسا ہوا کہ خدا کا کلام ناتن نبی پر نازل ہوا'' (1۔تواریخ 3:17)

''خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یوحنا پر نازل ہوا'' (انجیل لوقا 2:3)

''خدا کا کلام ترقی کرتا اور پھیلتا گیا'' (اعمال 24:12)

''تمام علاقہ میں خدا کا کلام پھیل گیا'' (اعمال 49:13)

ان سب مقامات پر اور دیگر بے شمار آیات بائبل میں کلمہ حکم اور بات کے معنی میں آیا ہے۔ بہر حال حضرت عیسیٰ کے بارے میں کلمۃ اللہ ان کی تشریف وخصوصیت بتانے کے لیے آیا ہے نہ کہ ان کی الوہیت، مطلب یہ کہ ان کی خلاف عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کی ولادت اسی طرح کلمہ کن سے ہوئی جس طرح حضرت آدم علیہ السلام

کی ولادت کلمہ کن سے ہوئی چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (عمران:59)

''اللہ کے نزدیک عیسیٰ (علیہ السلام) کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ''ہوجا'' اور وہ ہوگیا۔''

اور پھر فرمایا

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝ مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝

''یہ ہے عیسیٰ بن مریم (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں۔ یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے، وہ پاک ہے۔ جب وہ فیصلہ فرما دیتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لئے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔''

(مریم:۳۴،۵۳)

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ فرقہ جہمیہ کی تردید میں فرماتے ہیں۔

"اَلْكَلِمَةُ الَّتِيْ اَلْقَاهَا اِلٰى مَرْيَمَ حِيْنَ قَالَ لَهٗ "كُنْ" فَكَانَ عِيْسٰى بِكُنْ وَ لَيْسَ عِيْسٰى هُوَ "كُنْ" وَ لٰكِنْ بِكُنْ كَانَ فَكُنْ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى قَوْلٌ وَ لَيْسَ "كُنْ" مَخْلُوْقًا، وَكَذَبَ النَّصَارٰى وَ الْجَهْمِيَةُ عَلَى اللّٰهِ فِيْ اَمْرِ عِيْسٰى."

''حضرت مریم کی طرف جس کلمہ کو القا فرمایا وہ کلمہ کن تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔ وہ خود کلمہ کن نہ تھے۔ لہٰذا لفظ کن اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور اللہ کا کلمہ مخلوق نہیں ہو سکتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں نصاریٰ اور فرقہ جہمیہ، دونوں نے اللہ پر جھوٹ اور افترا باندھا۔''

(ہدایۃ المستفید ص 311)

اسباب تو ظاہر کا پردہ ہیں، زندگی اور وجود تو جسے بھی ملتی ہے خدا کے حکم سے ہی ملتی ہے اور بس۔

چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت میں یہودی آپ کی خصوصی شان کو نہیں مانتے تھے اس لیے قرآن میں اللہ نے آپ کو کلمۃ اللہ فرمایا یعنی آپ حضرت مریم کے کسی یہودی سپاہی سے تعلقات کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئے (معاذ اللہ) بلکہ یہ اللہ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئے ہیں۔ وگرنہ حقیقت میں تو ساری مخلوقات اللہ کے ہی حکم سے پیدا ہوئی ہیں۔ مثلاً بائبل مقدس کی یہ آیت پڑھیں۔

"آسمان خداوند کے کلام سے اور اس کا سارا لشکر اس کے منہ کے دم سے بنا۔"

(زبور 6:33)

اور آگے چل کر آیت 9 میں ہے۔

"کیونکہ اس نے فرمایا اور ہو گیا اس نے حکم دیا اور واقع ہوا۔" (زبور 9:33)

پھر زبور 148 میں ہے۔

"خداوند کی حمد کرو۔ آسمان پر سے خداوند کی حمد کرو۔ بلندیوں پر اس کی حمد کرو۔ سورج! اے چاند! اس کی حمد کرو۔ اے نورانی ستارو! سب اس کی حمد کرو۔ اے فلک الافلاک! اس کی حمد کرو۔ اور تو بھی اے فضا پر کے پانی۔ یہ سب خداوند کے نام کی حمد کریں۔ کیونکہ اس نے حکم دیا اور یہ پیدا ہو گئے۔ اس نے ان کو ابدالآباد کیلئے قائم کیا ہے۔"

(زبور 148۔1 تا 6)

زبور کے اس کلام کے مطابق تو ساری مخلوقات اللہ کے کلمہ کن کا نتیجہ ہے اس اعتبار سے تو سب کلمۃ اللہ ٹھہرے۔

حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو کلمۃ اللہ کیوں کہا؟

اب ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کو کلمۃ اللہ کیوں کہا گیا۔ اس کی چند حکمتیں تو آپ پچھلی سطور میں پڑھ آئے ہیں۔ یہاں ہم علمائے اسلام کے مختلف اقوالات کی روشنی میں آپ کے کلمۃ اللہ ہونے کی حکمتوں پر غور کریں گے۔

1۔ شیخ اسلام امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

"مسیح خود نہ تو "کلمۃ اللہ" ہے اور نہ خدا کی صفات میں سے کوئی صفت ہے بلکہ وہ مخلوق ہے جو کلمۃ اللہ سے پیدا ہوئی، اور اس کا نام "کلمہ" اس لیے رکھا گیا کہ اس کی

تخلیق رسم معتاد کے مطابق نہیں ہوئی تھی بلکہ "کن" سے ہوئی۔"

(تفسیر سورۃ اخلاص، صفحہ 75)

2۔ جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ یہودی حضرت مسیح علیہ السلام کی بغیر باپ کے پیدائش کو نہیں مانتے بلکہ ان کی کتب میں موجود روایات کے مطابق جب حضرت مریم حجرے میں اللہ کی عبادت کیا کرتی تھیں تو ایک یہودی فوجی کے ساتھ آپ کے ناجائز تعلقات کے نتیجے میں حضرت مسیح علیہ السلام کی پیدائش ہوئی (معاذ اللہ) اللہ نے یہودیوں کے اس الزام کو رد کرنے کے لیے خصوصی طور پر آپ کو "کلمۃ اللہ" فرمایا۔ وگرنہ ساری مخلوق اللہ ہی کے کلمہ سے پیدا ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی تو پھر بھی والدہ تھیں حضرت آدم علیہ السلام کے تو سرے سے والدین ہی نہیں تھے۔ اسباب تو ظاہر کا پردہ ہیں، زندگی تو جیسے بھی ملتی ہے اللہ کے کلمہ کن ہی کی بدولت ملتی ہے۔

3۔ عربی لغت میں سبب کا اطلاق مسبب پر ہوتا رہتا ہے جیسے حضور ﷺ نے اپنے متعلق فرمایا۔ "انا دعوۃ ابی ابراھیم" یعنی میں اپنے پدر بزرگوار حضرت ابراہیم کی دعا ہوں۔ حالانکہ آپ دعا نہ تھے بلکہ دعا کا جواب تھے۔ چونکہ دعائے ابراہیمی آپ کی تشریف آوری کا سبب بنی اس لیے آپ پر دعا کا اطلاق کر دیا گیا۔ اسی طرح کلمہ کے ذریعے جس کی ولادت ہوئی اس کو کلمہ کہہ دینا لغت اور محاورے کے مطابق ہے۔"

4۔ امام غزالی حضرت مسیح علیہ السلام کو کلمۃ اللہ کہنے کی ایک اور وجہ بیان فرماتے ہیں کہ کسی بچے کی پیدائش میں دو عامل کارفرما ہوتے ہیں، ایک عامل نطفہ اور دوسرا اللہ تعالیٰ کا کلمہ کن کہنا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں چونکہ پہلے عامل (نطفہ) کا کوئی دخل نہیں تھا اس لیے دوسرے عامل کی طرف نسبت کر کے آپ کو کلمۃ اللہ کہا گیا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مادی اسباب کے واسطہ کے بغیر صرف کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔

مصنف کی دیگر زیر طبع کتب

عقیدہ تحریف بائبل: اسلامی تعلیمات کی روشنی میں
انجیل برنباس اور بشارات نبوی ﷺ
قرآن مجید اور بائبل مقدس کے تراجم میں بنیادی فرق (تحقیقی مقالہ)
ردعیسائیت پر ماہر بننے کا طریقہ
مسیحی مشنریوں کے علمی ونفسیاتی حربوں کا مقابلہ کس طرح کریں؟
قانون توہین رسالت: بائبل اور مغربی تاریخ کی روشنی میں
مقام عقل: یہودیت، مسیحیت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں
شریعت الٰہی یا فضل الٰہی: ایک گمراہ کن تصور
مکالمہ محبت
ردعیسائیت اور مسلمان علماء
ہمارے اسلاف کی علم دوستی اور شان خودداری
تعلیم یافتہ نظر آنے کے جدید طریقے (طنز ومزاح)
اکیسویں صدی میں دعوت اسلام اور ہماری ذمہ داریاں
خصوصی انٹرویو: ہفت روزہ زندگی
موروثی گناہ: قرآن مجید اور بائبل مقدس کی روشنی میں
معجزات نبوی ﷺ پر مسیحی اعتراضات کا ایک جائزہ
عصمت انبیاء علیہم السلام: از روئے قرآن اور بائبل